کسی حسن
تمنا یاد

بادل گرجیں جمنا پار

بادل گرجیں جمنا پار

سُدرشن شرما

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

پہلی بار: ستمبر ۱۹۸۱ء
قیمت : ۱۸ روپے
کتابت : حفیظ الرحمٰن
مطبع : اعلیٰ پریس، دہلی

زیرِ اہتمام:
پریم گوپال متل

BADAL GARJAIN JAMUNA PAAR (SHORT STORIES)
BY SUDARSHAN SHARMA 18/-

والدِ محترم

شری شیورام شرما

کے چرنوں میں!

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

——— سدرشن شرما

ترتیب

پرکاش پنڈت

سدرشن گذشتہ بیس اکیس برس سے افسانے لکھ رہے ہیں لیکن ان کے لاابالی پن نے انھیں اب تک گمنامی کے اندھیروں میں چھپا رکھا ہے۔ گاہے گاہے ان کے افسانے نظر سے گزرتے رہتے ہیں لیکن ان میں تواتر کبھی قائم نہیں ہوا۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ان کا پہلا افسانہ 'بادل گرجیں جمنا پار' روزانہ پرتاپ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ اور افسانے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے اور پھر طویل خاموشی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس عرصے میں انہوں نے کچھ لکھا نہ ہو لیکن مزاج کا دہی تلون اور لاتعلقی تحریر اور تشہیر کے درمیان آڑے آتی رہی۔

پیش نظر مجموعے میں ان کے بارہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانے شامل ہیں۔ اس میں ابتدائی دور کے افسانے بھی ہیں اور تازہ ترین بھی۔ ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سدرشن جی کسی خاص موضوع کے ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ ان کے ہر افسانے کا موضوع دوسرے افسانے سے جداگانہ ہے لیکن ایک جذبہ ایسا ہے جو ان کے تمام افسانوں میں بہر صورت

اُجاگر ہوتا ہے، اور وہ ہے غریبوں، مجبوروں اور بے کسوں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ۔ ان کی خستہ حالی اور پریشان حالی کی اصلاح کا جذبہ۔ "دھرتی روا ٹھی" افسانے میں یہ جذبہ بڑی شدت کے ساتھ اور بڑے پُر اثر انداز میں نمایاں ہوا ہے۔ ان افسانوں کے کردار ہماری زندگی کے مختلف روپ پیش کرتے ہیں۔ ان میں بناوٹ اور تصنع کو قطعی دخل نہیں۔ جس طرح کی زندگی ہم جیتے ہیں ان افسانوں میں اسی کا عکس نظر آتا ہے ان کا کوئی بھی کردار جیمس بانڈ قسم کا مافوق الفطرت کردار نہیں ہے، البتہ کہیں کہیں سدرشن جی ذرا مبالغے سے کام لے گئے ہیں اور ایسا ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ہوا ہے جو اگر اس مجموعے میں شامل نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ یہ افسانے انھوں نے شاید اس خیال سے شامل کر لیے ہیں کہ ان کے ادبی سفر کے ارتقا کا اندازہ ہو سکے اور اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کی شرکت نامناسب بھی نہیں ہے۔

ہمارا موجودہ دور مشینی دور ہے جس میں آج کا انسان ایک پُرزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ گردش ہمہ وقت گردش۔ اس کے لئے تفریح کے

مواقع کم سے کم تر ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں ایسی کوئی چیز نظر سے گزرے جو بغیر کسی پیچیدگی کے چند لمحوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کر سکے اور اعصابی تناؤ کو ذرا کم کر سکے تو یہ اپنے آپ میں کافی بڑی بات ہے "گمشدہ نیکلس" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں سدرشن جی نے ایک چھوٹی سی بات کو بڑے پُرلطف اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سدرشن جی کو چاہیئے کہ اس نوعیت کے کچھ اور افسانے لکھیں اور انہیں الگ سے کتابی صورت میں شائع کرائیں۔ آج کی بے لطف اور بے جان زندگی میں ان کی بڑی ضرورت ہے۔

ماحول کے مطابق ان افسانوں کی زبان عام اور سادہ ہے جو ان کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ ادارہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس قابلِ ستائش ہے کہ اس نے اس نووارد (نوآموز نہیں) افسانہ نگار

کے افسانوں کو شائع کرنے کا حوصلہ دکھایا
اور ادیب کی شہرت کے مقابلے میں اس
کی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا۔ مجھے امید ہے
کہ اردو دنیا اس اقدام کو مستحسن نظروں
سے دیکھے گی۔

پرکاش پنڈت

۱۸
۸
۶۸۱

بادل گرجیں جمنا پار

تیز رفتار گاڑی رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ میں آج تین سال بعد اپنے گاؤں واپس جارہا تھا۔ اپنے ان لہلہاتے ہرے بھرے کھیتوں میں مچلنے کے لئے جہاں میرے بچپن کی شرارتیں چھپی تھیں۔ اپنے پیارے بابوجی سے ملنے۔ جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور اپنے بھیا گوپال سے ملنے، جو انسان کے روپ میں دیوتا تھے۔ آدھی آدھی رات تک جمنا کنارے بنسی بجاتے اور گیت گاتے رہتے تھے۔ بابوجی کئی بار منع کر چکے تھے۔ کہ اکیلے اتنی رات گئے جمنا پر نہ جایا کرو۔ مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے۔

"میرے پاؤں خود بخود جمنا کی اور چل پڑتے ہیں بابوجی! میرے دل کو وہاں شانتی ملتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون ملتا ہے مجھے جمنا کنارے۔

اور اب تو بابوجی نے انہیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

جمنا ـــــ کتنا پوتر اور پیارا نام ہے۔ مگر اس نام کے آتے ہی میری رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ کتنی دردناک اور وحشت انگیز کہانی ہے اس ندی کی۔

اور میں خیالوں میں گم ہو گیا۔

بہت دیر پہلے کی بات ـــــ کہ یہ ندی ہمیشہ پانی سے لبالب رہتی تھی۔ اور آس پاس کے گاؤں کو زندگی بخشتی تھی۔ مگر ایک بار اچانک سوکھ گئی اور پھر کبھی اس میں پانی نہ آیا۔ موسلادھار بارش ہوئی۔ لیکن اس میں پانی نہ آیا۔ قرب و جوار کے کھیت سُوکھ گئے۔ درخت مرجھا گئے۔ گاؤں میں قحط پڑ گیا۔ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ تب کہیں سے کوئی درویش آیا۔ جس نے بتایا کہ ندی قربانی مانگتی ہے۔ ایک نوجوان اور کنواری لڑکی کی۔ جب تک کسی کا خون نہیں بہے گا ندی میں پانی نہیں آئے گا۔ اور لوگ یونہی بلک بلک کر مر جائیں گے۔

ہمارے ہی گاؤں میں ایک ملاح رہتا تھا۔ جس کے ایک لڑکی تھی اٹھارہ سال کی، جوان اور حسین۔ ایک شام گاؤں کے سب لوگ ندی پر اکٹھے ہوئے۔ اور اس ملاح نے اپنے ہاتھوں سے جمنا کا گلا کاٹ دیا۔ خون کے پھوارے پھوٹ پڑے۔ جمنا تڑپ اٹھی۔ گاؤں والے بُت بنے آنکھیں بند کئے کھڑے رہے۔ جب انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جمنا کا سر اور جسم دونوں غائب تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہاں گئے۔ آسمان لے گیا۔

یا زمین کھا گئی۔ اسی رات زور کا طوفان آیا۔ بادل گرجے۔ بجلی کڑکی اور ندی میں سیلاب آگیا۔ کتنے ہی گاؤں سیلاب کی نذر ہو گئے۔ مگر اس کے بعد ندی کبھی نہ سوکھی۔ کبھی پانی ختم نہ ہوا۔ اور کبھی ارد گرد کے گاؤں میں قحط نہ پڑا۔ تب سے گاؤں کے لوگ جمنا کے نام سے کانپنے لگے۔ کئی لوگ اب بھی کہتے ہیں۔ کہ جب کبھی آسمان پر بادل گرجتے ہیں۔ بجلی کوندتی ہے۔ تو ندی میں سے کسی عورت کے سسکنے کی آواز آتی ہے۔

ان خیالات کے آتے ہی میرا دل سہم گیا۔

بادل کی گرج نے میرے خیالات کو توڑ دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گاڑی اب بھی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ مگر آسمان پر نگاہ جاتے ہی میں پریشان ہو گیا۔ کالے سیاہ اور ڈراونے بادل منہ پھاڑے بڑی تیزی سے آسمان پر چھا رہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے، اب کیا ہوگا — میرا گاؤں اسٹیشن سے پانچ میل دُور تھا۔ جمنا کے دوسرے کنارے پر۔ کیسے پہنچوں گا وہاں —؟ اپنے آنے کی خبر تک نہ دی۔ اسٹیشن پر ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ گھوڑا گاڑی اس طوفان میں کہاں سے ملے گا۔ کیسے کٹے گی یہ طوفانی رات — دل میں عجیب سوالات ابھرے۔

کاش میں نے آنے کی خبر کر دی ہوتی۔ تب تو گوپال بھیا مجھے ضرور لینے آتے۔ چاہے آندھی ہوتی یا طوفان —

سیتا پور کے اسٹیشن پہ میرے سوائے کوئی سواری نہ اُتری۔

گاڑی چل دی - میں اکیلا کھڑا رہ گیا - چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ موت کی سی خاموشی، اور سنسان سا سناٹا تھا۔ اسٹیشن کا چوکیدار بھی شاید اس سے ڈر کر کہیں چھپ گیا تھا۔ بادل گرجنے لگے - بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مجھے اکیلے ڈر لگنے لگا - میں نے اٹیچی اٹھائی - اور اسٹیشن سے باہر کی طرف جونہی قدم رکھا، میرے پاؤں لڑکھڑا گئے - میری آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ میری روح کانپ اٹھی - میں نے اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح ملا۔ پھر دیکھا، مگر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا۔

وہ ایک گھوڑا گاڑی تھی جس کے آگے چاندی جیسا سفید گھوڑا تھا۔ اور اس کے پاس دو سایے تھے۔ جو ٹکٹکی باندھے میری طرف گھور رہے تھے ___

میرے خدا۔ اب کیا ہوگا - میرے پاؤں پیچھے بھاگنے لگے -

اتنے میں آواز آئی -

" پرکاش! تم آگئے!"

برف سی ٹھنڈی آواز کو سن کر میری چیخ نکل گئی۔ مگر آواز جانی پہچانی تھی -

" ہا ___ ں - ہا ___ ں - میری سانس رُک گئی -

" آؤ - آؤ - آگے آؤ - دیکھو میں گھوڑا گاڑی لایا ہوں - تمہیں لینے کے لیے - "

دونوں سائے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے - وہ میرے

نزدیک آرہے تھے۔ اور میری روح میرا بدن چھوڑ رہی تھی۔ اتنے ہی زور سے بجلی کڑکی۔ ایک سیکنڈ کے لئے روشنی ہوئی۔ میں خوشی سے چلا اٹھا۔

"بھیا۔ گوپال۔ بھیا۔۔"

میں دوڑ کر بھیا سے لپٹ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں زمین پر گرا پڑا تھا۔ اور وہ میرے پاس کھڑے دوسرے سایے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گوپال بھیا اور سایہ جا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے گوپال بھیا کو۔ مجھے گرا چھوڑ کر گاڑی میں جا بیٹھے۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔

"آؤ پرکاش! گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔۔۔" پتھر کی سی سخت آواز نے مجھے زمین سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اور میں کپڑے جھاڑتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا۔

گوپال بھیا گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھا تھا وہ سایہ۔ اور سایہ کے ساتھ تھا میں۔ گاڑی چل رہی تھی۔ لیکن ہم تینوں خاموش تھے۔ بجلی پھر کوندی۔ میری نظریں اٹھیں۔ اور کسی کی خاموش نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ ایک جھلک، اور پھر اندھیرا۔ میری روح تڑپ اٹھی۔ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر۔ میرے خدا! وہ عورت تھی۔ دیویوں سے بھی زیادہ حسین۔ برف سا سفید چہرہ۔ سونے کی سی سنہری زلفیں۔ سیاہ پلکیں۔ جھیل کی طرح گہری آنکھیں۔ مگر بے نور۔ میں نے اتنا نکھرا ہوا حسن آج تک اس زمین پر نہ دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میرا جسم پسینہ سے تر ہو گیا۔

"بھیا۔۔۔"

"ہاں -" آواز آئی -

"یہ کون ہیں ؟"

"تمہاری بھابی -"

"آپ نے شادی کرلی - اور مجھے خبر تک نہ دی -"

"اپنے بابو جی سے پوچھنا -"

گوپال بھیّا کی کھوکھلی آواز سے میں تھرا اٹھا -

گاڑی جمنا کے پل پر سے گزر رہی تھی - بادل پھر گرجنے لگے - ہوا تیز ہوگئی - اور ساتھ ہی گھوڑے کی رفتار - جمنا کے دوسرے کنارے بھیّا نے گاڑی روک دی - اور بھابی کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر گئے - میں بھی گاڑی سے اترا - ہماری حویلی بالکل قریب تھی - بابو جی کے کمرے سے لیمپ کی روشنی نظر آرہی تھی -

"تم جاؤ پرکاش - ہم ٹھہر کر آئیں گے -"

"مگر اب تو ایک بج چکا ہے بھیّا!" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا - "میرا کہا مانو"

بھیّا کی بے رخی اور پتھریلی آواز نے مجھے چپ کرادیا - میں نے اپنی اٹھائی اور بھاری قدموں سے حویلی کی جانب چل دیا -

میں نے ابھی ڈیوڑھی میں ہی قدم رکھا تھا - کہ بادل پھر زور سے گرجنے لگے - بجلی چمکنے لگی - آندھی اور بارش تیز ہوگئی - طوفان نے ہمارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا - میں بھیّا اور بھابی کے لئے بے چین ہو اٹھا - اور بہت زور سے پکارنے لگا -

" بھیا - بھیا - گھر آجاؤ - بھیا - زور کا طوفان آرہا ہے -"

مجھے امید تھی کہ میری آواز ضرور بھیا کے کانوں تک پہنچ جائے گی -

اس وقت بابوجی کے کمرہ کی کھڑکی کھلی -

" کون ہے باہر؟"

" میں ہوں بابوجی پرکاش!"

کھڑکی ایک دم بند ہو گئی - میں گھبرا گیا -

حویلی کا دروازہ دیر سے کھلا - میں نے اندر قدم رکھا - دروازہ کے پاس ہمارا نوکر کھڑا تھا - جو مدّت سے ہمارے ہاں تھا - اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا - بولا نہیں - میں نے اس کو اس روپ میں کبھی نہ دیکھا تھا - میں نے اٹیچی وہیں رکھ دی - اور بابوجی کے کمرے کی طرف بڑھا - مگر میرے پاؤں دروازے کے پاس پہنچ کر جم گئے - میں پریشان ہو گیا -

" کیا ہو گیا ہے اس گھر کو اور اِن گھر والوں کو؟"

بابوجی کا کمرہ بند تھا - اور لیمپ بجھ چکا تھا - یہ ایک انہونی بات تھی - میں تین سال کے بعد گھر واپس آؤں - اور میرے ساتھ ایسا برتاؤ - اتنی بے رُخی - میں نے دروازہ دھکیلا وہ کھُل گیا - میں نے لیمپ روشن کی - بابوجی لحاف میں منہ ڈھانپے پڑے تھے -

" بابوجی!"

بابوجی نے لحاف کو ذرا سا سرکایا - اور مجھے دیکھ کر پھر منہ ڈھانپ لیا -

میں نے دیکھا وہ کانپ رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔

"بابوجی!" میں نے انہیں بلایا۔ وہ اچھل کر زمین پر جا گرے۔ ان کی آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔ وہ ڈر سے کانپ رہے تھے۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں نے تمہیں نہیں مارا۔ میں تمہارا خونی نہیں۔ میں تمہارا قاتل نہیں۔ مجھے معاف کر دو گوپال!——"

وہ دوسرے کمرے میں بھاگ گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پکارا، مگر انہوں نے دروازہ نہ کھولا۔ میں پاگل ہوا تھا۔ پیچھے کو بھاگا۔

شمبھو اب بھی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا تماشہ ہے شمبھو! جلدی بتاؤ۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"شمبھو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

میں چیخ اٹھا۔

"چھوٹے صاحب" شمبھو کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا گوپال بھیا کو؟"

"کچھ نہیں۔ میں نہیں بتا سکتا۔"

شمبھو بھاگنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔

"چلو بتاؤ۔ کیا ہوا میرے بھیا گوپال کو؟"

"وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے چھوٹے بابو!" شمبھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کہاں ؟" میری آواز لرز گئی۔

"اپنی محبوبہ کے پاس۔"

"کیا بکتے ہو شمبھو! گوپال بھیا اور بھابی تو ابھی میرے ساتھ اسٹیشن سے آئے ہیں۔"

"یہ دھوکا ہے۔ سراسر دھوکہ ہے۔"

شمبھو کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"وہ ایک خوفناک اور بھیانک رات تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ طوفان زوروں پر تھا۔ اور چھوٹے مالک نے جمنا میں کود کر اپنی جان دے دی۔"

"کیوں ؟" میں چیخ اٹھا۔

"سندر ملاح کی بیٹی جمنا کے لئے۔ جسے چھوٹے مالک پیار کرتے تھے۔ مگر بابو جی کو یہ پسند نہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بابو جی نے اس لڑکی کو مروا کر جمنا میں پھینکوا دیا۔ اور جب اس کا علم چھوٹے مالک کو ہوا۔ وہ گاڑی لے کر جمنا کی طرف بھاگے۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ پل سے نیچے جمنا میں جا گری۔ اور ساتھ ہی چھوٹے مالک۔ جمنا میں طغیانی تھی۔ گاڑی اور چھوٹے مالک کا کچھ پتہ نہ چلا ـــــ"

اتنا کہہ کر شمبھو چپ ہو گیا۔

بادل پھر گرجے۔ بجلی کڑکی۔ طوفان اُمڈ آیا۔ جمنا کی لہریں اچھلنے لگیں۔ میری نظریں اٹھیں۔ اور کھڑکی سے باہر جمنا کے پل پر جم گئیں۔

ایک گھوڑا گاڑی جارہی تھی۔ گوپال بھیا چلا رہے تھے۔ اور وہی سایہ ان کی بغل میں اب بھی بیٹھا تھا۔ میں چلا اٹھا۔

"وہ دیکھو شمبھو! ۔ گوپال بھیا۔ اور ان کی گاڑی۔"

شمبھو نے اس طرف دیکھا۔

"ہاں چھوٹے بابو۔ جب بھی جمنا کے اس پار بادل گرجتے ہیں۔ بجلی کوندتی ہے۔ تو یہ گاڑی اس طرف جاتی ہے۔"

گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن نہ جانے میں اور شمبھو کتنی دیر اس خالی جگہ کو گھورتے رہے جہاں گوپال بھیا اور جمنا، جمنا کی گود میں ہمیشہ کے لئے سما گئے تھے

●●

لہو رنگ لائے گا

"دائیں۔ دائیں۔" توپیں گرج اُٹھیں۔

خاموش فضا میں ہلچل سی مچ گئی۔ دھرتی کانپ اُٹھی آسمان ہل گیا۔

"دائیں دائیں۔"

پہاڑوں کے سینے چھلنی ہونے لگے۔ بلاوں سے بسے گھر اجڑنے لگے۔ موت چاروں طرف ناچنے لگی۔ ہاہاکار مچ گئی۔

بوڑھے ہمالیہ کی سفید چادر پر لال دھبے پڑ گئے۔ انسان شیطان بن گیا۔

"دائیں دائیں"

"شیر سنگھ آگے بڑھو دشمن یہیں کہیں چھپا ہے۔"

شیر سنگھ نے سُنا اور دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگنے لگے۔

اُس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنی بندوق پر جمے تھے۔ اُس کے دل میں آگ تھی، اور آنکھوں میں شعلے۔

بدلہ بے عزتی کا بدلہ۔ نہتّے اور معصوم انسانوں کے خون کا بدلہ۔ اپنے ملک پر کیئے گئے حملہ کا بدلہ۔

شیر سنگھ کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ اُس کے نتھنے پھول گئے۔ اُس کے بازو پھڑکنے لگے۔

آج اُس کے ملک پر حملہ ہوا تھا۔ ایک لٹیرے کا اُس ملک پر جو امن کا دیوتا تھا۔ شانتی کا پجاری تھا۔ جس کی سب سے دوستی تھی۔ جس کو سب پر وشواش تھا۔

"وشواس گھات" شیر سنگھ کے ہونٹ ہلے۔

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میجر دلیر سنگھ اور دوسرے ساتھی اپنی بندوق میں کارتوس بھر رہے تھے۔ شیر سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔

اُس نے اپنی نظر برف سے ڈھکی اونچی اونچی چوٹیوں پر گاڑی جو شاید انسان کے پاگل پن پر مسکرا رہی تھیں۔ انسان۔ جو اپنے بھلے کے لئے دوسروں کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ دوسروں کے گھر کو آگ لگا کر خود تماشا دیکھتا ہے۔

انسان کا دشمن انسان۔ ....

ہوا کی ٹھنڈی لہر نے شیر سنگھ کو چونکا دیا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند پہاڑیوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ اور ننھے ننھے سائے آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

شیر سنگھ کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ اُسے اپنے بچپن کے دن یاد آ گئے، جب وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ہرے بھرے کھیت ناچنے لگے۔ جن میں اُس کے باپ دادا کی ہڈیاں اور پسینہ ملے تھے۔

ساتھی کی یاد اُسے ستانے لگی۔ اُسے یاد آیا جب وہ ایک بار دلی گیا تھا اپنے بیاہ کے لئے گہنے اور کپڑے بنوانے، حیران رہ گیا تھا وہ وہاں کی ہر چیز دیکھ کر۔

اونچے اونچے مکان

لمبے چوڑے بازار

چاروں طرف بھیڑ۔ ہنستے ہوئے مسکراتے ہول۔ شیر سنگھ مسکرا اٹھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ وہ کانپ گیا۔

اونچے اونچے مکان ...... اچانک جلنے لگے۔ لمبے چوڑے بازار ویران ہو گئے۔

ہنسی خوشی کی آوازیں چیخوں اور آہوں میں بدل گئیں۔ مسکراتے چہرے آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ چاروں طرف ایک ہاہا کار سی مچ گئی۔

شیر سنگھ پاگل ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور چیخ اٹھا۔ ”نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ ان کی رکھشا کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ میں ان کی رکھشا ضرور کروں گا۔“

شیر سنگھ کی انگلیاں بندوق کے گھوڑے پر ناچنے لگیں۔

اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

تبھی کوئی پیچھے سے چلا اٹھا۔

"شیر سنگھ"

اور شیر سنگھ ایک ہی چھلانگ میں کود کر کھائی کے دوسری طرف جا گرا۔

گولی اُس کے کان کے پاس سے گزر گئی۔

شیر سنگھ بچ گیا۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی پر سنبھل نہ سکا اور برف کے اوپر پھسلتا ہی گیا۔ بہت دُور جا گرا وہ پہاڑی کے نیچے۔ اُس کا ایک ایک جوڑ درد کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح پڑا رہا کئی طرح کے سوالات اُس کے دماغ میں آنے لگے۔ وہ کہاں ہے۔ میجر دلیر سنگھ اور دوسرے ساتھی کہاں گئے۔ اور کسی خیال کے آتے ہی وہ کانپ گیا۔ میجر دلیر کے لفظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"اس پہاڑی کی آڑ میں چینیوں کا ایک بہت بڑا سپلائی اسٹیشن ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں چینی اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اگر کسی طرح وہ سپلائی اسٹیشن برباد کر دیا جائے تو ہمیں آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑ سکتی۔"

شیر سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چاروں طرف گھورنے لگا۔ گھُپ اندھیرا تھا۔ موت کی سی خاموشی تھی۔ شیر سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرے وہ۔ کدھر جائے وہ چاروں طرف موت منہ پھاڑے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ قدم قدم پر خطرہ تھا۔ ایک چھوٹی سی بھول اُس کی جان

لے سکتی تھی۔

شیر سنگھ کو اپنے پاس ہی کچھ سراہٹ سُنائی دی۔ وہ وہیں رُک گیا۔ سانس روک کر کوئی اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔

"دس منٹ کے اندر ہی یہ پانچ سو بھارتی موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"پانچ ہزار کے سامنے کبھی پانچ سو ٹک نہیں سکتے۔" آوازیں چپ ہو گئیں۔

شیر سنگھ کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُس نے کچھ دیر سوچا اور پھر آہستہ آہستہ اُن آوازوں کی طرف رینگنے لگا۔

برف کے اوپر پڑے پڑے اُس کا بدن بے جان ہوتا جا رہا تھا۔ مگر ایک خیال اُس کو آگے کی طرف کھینچے جا رہا تھا۔ وہ کسی طرح اپنے ساتھیوں کی جان بچا لے۔

کرم سنگھ کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جو اُس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ جس کے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جن کا کرم سنگھ کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ اگر کرم سنگھ کو کچھ ہو گیا تو اُن بچوں کا کیا ہو گا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کا دھیان اپنی بوڑھی ماں کی طرف چلا گیا۔ جس کا وہ اکلوتا لڑکا تھا۔ جس کی ساری آرزوئیں اُسی سے وابستہ تھیں۔ جس کے سہارے وہ زندہ تھی۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دیگی۔ اور اس کی بیوی جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی ابھی

نہیں اتری تھی۔ جس نے شیر سنگھ کو ابھی جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔ اُس کی مانگ کا سیندور اگر مٹ گیا تو۔

شیر سنگھ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ چونک پڑا اُسے اپنے پاس ہی کچھ شور سا سُنائی دیا۔

دھیمی دھیمی انسانی آوازیں۔

بندوقوں کی کھڑ کھڑاہٹ۔

پتوں کی چرمراہٹ۔

شیر سنگھ ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ بندوق اُس کے سینے کے ساتھ چپکی تھی۔

قطاروں میں چینی سپاہی اُس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں چینی اُس کی آنکھوں کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ ڈر کی ایک لہر اُس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ اوپر سے نیچے تک کانپ گیا۔ تبھی کسی کی کڑکتی آواز اُسے سُنائی دی۔

"ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اپنی توپوں کے منہ کھول دو۔ تباہ و برباد کر دو ان مٹھی بھر کیڑوں کو۔"

"کیڑے" شیر سنگھ دانت پیسنے لگا۔ ہندوستان کا سپاہی کیڑا۔ جس کی بہادری کا لوہا سارا سنسار مانتا ہے۔ جن کے سینے فولاد سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اور حوصلے ہمالیہ سے بھی زیادہ اونچے۔

اُس کے دل میں آیا کہ وہ ایک ہی فائر میں بولتے ہوئے آدمی کو

ٹھنڈا کر دے اور اپنا بوٹ اس کی چھاتی پر رکھ کر کہے۔ لے دیکھ بھارتی جوان کی بہادری۔ تبھی اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے کہیں بڑے بڑے درخت گرائے جا رہے ہوں۔ اور اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے جہاں بڑے بڑے درخت کھڑے تھے۔ توپوں اور بارود کے ڈھیر لگ گئے۔

چینی سپاہی ڈھیر کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ شیر سنگھ کا خون جمنے لگا۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ کیسے بچائے وہ اپنے ساتھیوں کو۔ پانچ سو پانچ ہزار کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ کرم سنگھ اور اس کے بچے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

اُونچے اُونچے مکان جلنے لگے۔

بھلے چوڑے بازار ویران ہو گئے۔

لہلہاتے کھیت سُوکھ گئے۔

ہنسی خوشی کی آوازیں چیخوں اور آہوں میں بدل گئیں۔

ہنستے چہرے آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

شیر سنگھ کی انگلیاں بندوق کے گھوڑے پر ناچنے لگیں۔ گھوڑا دب گیا۔

گولی چل گئی۔

شیر سنگھ کانپ گیا۔

چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ شیر سنگھ کے کانوں میں بڑے بڑے گولوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پہاڑ پھٹنے لگے۔ دھرتی اور آکاش

کانپنے لگے۔

شیر سنگھ حیران کھڑا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی ایک ہی گولی نے پانچ ہزار چینیوں کو موت کی نیند سُلا دیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی گولی بارود کے ڈھیر میں جا لگی ہے۔ جس نے چاروں طرف تباہی مچا دی ہے۔ چینی اپنے ہی بارود سے جل رہے ہیں۔ دوسروں کے لئے کھودے گڑھے میں خود ہی گر رہے ہیں۔

شیر سنگھ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ کوئی بڑی سی چیز اُس سے ٹکرائی وہ زمین سے کئی گز اوپر اچھل پڑا۔ اور جب اُس کی آنکھیں کھلیں تو وہ پہاڑی کی چوٹی پر پڑا تھا۔ جسم کی ہڈیاں کئی جگہوں سے ٹوٹ گئی تھیں۔ درد سے اُس کی سانس رکنے لگی۔

پہاڑی کے پیچھے سے سورج کی کرنیں چمکنے لگیں۔ اُس نے نظریں گھما کر پہاڑی کے نیچے دیکھا۔ چینی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ شیر سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔ وہ پھر بیہوش ہو گیا۔ اُس کا دماغ گھومنے لگا۔

شیر سنگھ تانگے میں بیٹھا اپنے گاؤں واپس جا رہا ہے۔ اُس نے فوجی وردی پہن رکھی ہے۔ اُس کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ اپنی ماں سے ملے گا۔ اپنی لاجو سے ملے گا۔

اُس نے گھر کے اندر پاؤں رکھا۔ "ماں۔"

"میرا شیرا" شیر سنگھ کی ماں چارپائی پر پڑی بلک رہی تھی شیر سنگھ

نے دوڑ کر ماں کے پاؤں پکڑ لیئے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
"تم نے بہت دیر لگا دی شیرا۔ تمہیں اپنی بوڑھی ماں کا بھی دھیان نہ رہا۔ کس کے سہارے مجھے چھوڑ دیا تھا شیرا۔"
ماں نے اُسے کلیجے سے لگا لیا۔ شیر سنگھ کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے۔
"میں اب تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا ماں۔" شیر سنگھ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں دو بڑی بڑی آنکھیں اُس کے چہرے پر جمی تھیں۔ شیر سنگھ نے ہاتھوں کے بنڈل لاجو کے آگے پھینک دیئے۔ ساویکی دتی سے تمہارے لئے کتنی اچھی اچھی ساڑھیاں لایا ہوں۔ اور شیر سنگھ نے لاجو کے آگے ڈھیر لگا دیا۔ یہ تیری کنگھی۔ یہ تیری دانتن۔ یہ تیرا سُرمہ۔ یہ ماں کی اوڑھنی۔ مگر لاجو کی آنکھیں تو شیرا کے لال لال گالوں پر جمی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔
"کیا بات ہے لاجو۔ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔"
"میں — میں" لاجو اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے گال لال ہو گئے۔ شیر سنگھ کی نظریں لاجو کے اُبھرے پیٹ پر پڑیں۔ شیرا خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس نے لاجو کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔
تبھی شیر سنگھ کی آنکھیں کھُل گئیں۔ درد کی ایک لہر اُس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ تپتی زمین اور نوکیلے پتھر اُسے چبھنے لگے۔ "آہ" —

شیر سنگھ کراہ اٹھا اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُن سے آنسو بہہ نکلے۔

"شیر سنگھ" میجر دلیر سنگھ اور اُس کے دوسرے ساتھی اُس پر جھکے ہوئے تھے۔

اُس نے بولنے کی کوشش کی۔ آواز اُس کے گلے میں ہی پھنس گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"تم انسان نہیں۔ کوئی دیوتا ہو شیر سنگھ۔ ہندوستان کی تاریخ تمہیں کبھی نہ بھول سکے گی۔ تم امر ہو گئے۔ شیر سنگھ۔" کہتے کہتے دلیر سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

شیر سنگھ نے آنکھیں کھولیں

اُس کے ہونٹ ہلے "ماں" اور ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئے۔

—— شیر سنگھ امر ہو گیا ——

۱۹۶۲ء

دھرتی رو اُٹھی

راجن جب ہوائی جہاز سے اُترا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ زمین کو چھوتے ہی اس کے پاؤں ناچنے لگے۔ آج اُس کی خوشی کی انتہا نہ تھی وہ پانچ سال کے بعد امریکہ سے انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے اپنے ملک واپس لوٹا تھا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کتنی پاک اور مقدس ہے یہ زمین، رام اور کرشن کی زمین۔ نانک اور گاندھی کو جنم دینے والی یہ سر سبز اور دلکش دھرتی۔ کتنا نیلا ہے یہ آسمان، کتنی میٹھی اور شربلی ہیں یہ ہوائیں۔ کتنی پیاری ہے یہاں کی ہر چیز۔ راجن نے اپنے پاؤں کو ہوائیں پھیلا دیا۔ وہ بھول گیا کہ دُور کھڑے اُس کے بوڑھے ماں باپ، اُس کو گلے لگانے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اس کے بچپن کے دوست اُس کا پُر جوش استقبال کرنے کے لئے بے چین ہیں۔

"میرا بھارت۔ میرے باپو کا بھارت" اُس کا دل بار بار پکار اُٹھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اُس کا چہرہ افسردہ اور غمگین ہو گیا۔ اُس نے رومال سے آنسو پونچھے اور بھاری قدموں سے ماں باپ کی طرف چل پڑا۔ جن کی شادی کی آشائیں اپنے اکلوتے بیٹے پر لگی تھیں۔ راجن کو دیکھتے ہی ماں باپ خوشی سے پاگل ہو اُٹھے۔ دوست یاروں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ مدّتوں سے بچھڑے ملے۔ سب کے دل بھر آئے۔

نریش کا بنگلہ آج نئی نویلی دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ دعوتیں اُڑ رہی تھیں قہقہے گونج رہے تھے۔ سبھی نریش کی قسمت کو سراہ رہے تھے۔ کتنا ہونہار بیٹا پایا ہے اس نے۔ اور نریش بھی فخر سے سینہ تانے خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ نریش نے خوب دل کھول کر راجن کے آنے کی خوشی میں خرچ کیا۔ اب اُسے کوئی فکر نہ تھی۔ وہ ہزاروں کما رہا تھا۔ مگر اب راجن لاکھوں کمائے گا۔ پہلے نریش کے پاس پانچ کارخانے ہیں اب بارہ ہو جائیں گے۔ وہ انہیں خیالات میں کھو گیا۔ جب تمام مہمان چلے گئے تو نریش نے راجن کو اپنے پاس بُلایا اور بڑے پیار سے کہا۔

" اب میں کام کرتے کرتے تھک چکا ہوں راجن۔ دو چار دن آرام کر لو اور پھر جلدی سے کاروبار سنبھالو۔ گورنمنٹ کے کتنے ہی آرڈر پڑے ہیں۔ کئی جگہ کام شروع ہو چکا ہے اور کئی کام ابھی ادھورے پڑے ہیں۔ مگر اب مجھے کوئی چنتا نہیں۔ تم لائق ہو، ہونہار ہو، مجھے یقین ہے تم سب

سنبھال لو گے ۔ آخر جو پچاس ہزار امریکہ میں خرچ کیئے ہیں اُن کے بھی تو پچاس لاکھ بنانے ہیں ۔" اور نریش مسکرانے لگا ۔ راجن سُن رہا تھا مگر اُس کا دم گھٹ رہا تھا ۔ بدن پسینہ سے تر بور رہا تھا ۔

" آخر ہم اتنے روپیوں کو کیا کریں گے پتا جی اپہلے کیا ہمارے پاس روپے کم ہیں جو پچاس ہزار کے پچاس لاکھ بنانے پڑیں گے ۔"

راجن بڑی مشکل سے کہہ پایا ۔ یہ سُنتے ہی نریش ہنس پڑا ۔ اور ساوتری کو آواز دے کر بولا ۔

" اجی سُنتی ہو ۔ تمہارا بیٹا کیا کہہ رہا ہے ۔ کہتا ہے ۔ روپیوں کو کیا کریں گے ۔ ارے بیٹا ۔ اس دُنیا میں روپیہ ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے سامنے دُنیا سر جھکاتی ہے ۔ جس کے پاس روپیہ نہیں وہ آدمی جوانی میں بھی بوڑھا ہے ۔ جس کے پاس روپیہ نہیں وہ دیانت دار ہوتے ہوئے بھی بد دیانت ہے ۔ سچا ہوتے ہوئے بھی جھوٹا ہے ۔ ایک ایسا پتھر ہے جس کو ہر آنے والا ٹھوکر مار کر مسکراتا ہے ۔ اور جس کے پاس دولت ہے ، اُس کی ہر بُرائی اچھائی میں بدل جاتی ہے ۔ اس کی دولت کی چمک لوگوں کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے ، اور وہ اُس میں کوئی بھی بُرائی نہیں دیکھ سکتے ۔ وہ جس کو چاہے خریدے ، جس کو چاہے مٹا دے ۔ جس کو چاہے خاک میں ملا دے ، اور جس کو چاہے آسمان پر بٹھا دے ۔ اس لئے میرے بیٹے یہ بات بھول کر بھی مت سوچنا کہ آج کا انسان اس دُنیا میں رُوپیہ کے بنا زندہ رہ سکتا ہے ۔ میرے باپ نے پچاس کمائے ۔

میں نے پچاس ہزار، اور تمہیں پچاس لاکھ بنانے پڑیں گے۔" راجن، نریش زور زور سے ہنسنے لگا۔

راجن سہم گیا۔

"مگر پتا جی مجھے یہ چور بازاری، جھوٹ، فریب اور مکاری سے اکٹھا کیا ہوا روپیہ نہیں چاہیئے۔ میں بے کسوں کی روٹی چھین کر دولت اکٹھی کرنا نہیں چاہتا، میں اپنے ضمیر کا خون نہیں کر سکتا، ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہو سکے گا۔ پتا جی ہمارے ملک میں لاکھوں کروڑوں ایسے آدمی ہیں جن کے پاس سر چھپانے کو ٹھکانا نہیں، جو رات کو خالی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سو جاتے ہیں۔ جن کے بچے چمچہ بھر دودھ کو ترستے ترستے دم توڑ دیتے ہیں۔ یہ غریب اور ان پڑھ لوگ۔ میں ان کو اور زیادہ دکھی کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے سوکھے مرجھائے اور پیلے چہروں کو دیکھ کر میرا دل رو پڑتا ہے۔ پتا جی اور پھر آج جب کہ ہمارے نیتا نئے نئے سپنے دیکھ رہے ہیں ایک نئے جگ کے نرمان میں لگے ہوئے ہیں، دیش کو خوش حال اور اونچا اٹھانے کے لیے ان تھک کوشش کر رہے ہیں۔ آج جبکہ ہمارا دیش ترقی کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ایک نئی صبح بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ ہمارے دیش کو دوسروں کا خون چوسنے کی نہیں۔ دیش کی لڑکھڑاتی ٹانگوں میں اپنا خون دے کر انہیں مضبوط کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ لیڈوں کے محل بنا کر رہنے والوں کی نہیں غریبوں کے جھونپڑے بنانے والوں کی ضرورت ہے۔

"بند کرو بکواس"۔ نریش چیخ پڑا۔ اُس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ نریش کے سنہری سپنے بکھرنے لگے۔ اُس کو اپنی امیدوں کے چراغ بجھتے دکھائی دیئے۔ اُس کی آرزوئیں دم توڑنے لگیں۔ نوٹوں کے محل ہوا میں اُڑنے لگے۔۔ مگر پھر بھی وہ ذرا سنبھل کر بولا۔

"تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ راجن تم ان کیڑوں مکوڑوں کو بے موت مرنے سے نہیں بچا سکتے۔ یہ موت سے جھٹ پٹاتے ہوئے لوگ ہمارے ملک پر ایک بوجھ ہیں۔ جن کا جلدی سے جلدی اُٹھ جانا ہی بہتر ہے۔ اور پھر تم تو روپیہ کما کر اُن کی مدد کر سکتے ہو۔ اُن کے لئے گھر بنا سکتے ہو۔ ان کے پیٹ بھرنے کے لئے کھانا دے سکتے ہو۔" نریش نے اپنا رُخ بدل دیا۔

"نہیں نہیں۔ میں اب اِن کارخانوں کو نہیں چلا سکتا۔ میں اب اور اس غریب سرکار کو نہیں لوٹ سکتا۔ اونچے دام لے کر۔ کرمچاریوں کو رشوت دے کر سستا لوہا لگا کر پل تیار کرنا یہ کام آپ اور میرے سے نہیں ہو سکے گا۔ پتاجی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لوہاندی کے پل ٹوٹنے سے تین سو سے زیادہ آدمی بے موت مر گئے تھے اور وہ پل ہماری ہی کمپنی نے بنایا تھا۔ کوئی نہیں جانتا مگر میں اور آپ جانتے ہیں کہ اُن سب کی موت کے ذمہ دار ہم تھے۔ اُن بدقسمت انسانوں کی چیخ پکار آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور جب وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میری روح کانپ اُٹھتی ہے۔ یہ دیش سے غداری ہے۔ سراسر دھوکہ ہے۔ یہ ایک ایسا

راستہ ہے جو میرے لئے نرو زخ ہے پتاجی : راجن کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

"گھر کا دیا گھر کو ہی آگ لگائے۔ میں آسے اِس سے پہلے ہی بجھا دوں گا۔

—— راجن تم مجھے اُپدیش دے رہے ہو، دیش بھگتی سکھا رہے ہو۔ ہوں۔ میں دیکھ لوں گا۔ تمہاری یہ دیش بھگتی۔ بھوکے مر دگے۔ پیسے پیسے کو محتاج ہو جاؤ گے۔ تب دیکھوں گا کون کرے گا۔ تمہاری مدد۔ کیسے مٹے گی تمہاری پیٹ کی بھوک۔ یہ دیش بھگتی۔ نکل جاؤ اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے اور پھر کبھی منہ نہ دکھانا نہیں چاہیئے مجھے تم جیسا نالائق بیٹا۔" نریش چلا کر گر پڑا۔

ارجن اٹھا۔ اٹیچی میں دو چار سوٹ ڈالے۔ پتاجی کے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔ ماں کے پاؤں پر گر کر خوب رویا۔ ماں نے بیٹے کو کس کر چھاتی سے لگا لیا۔ منت کی۔ سماجت کی۔ ماں کے پیار کی دہائی دی۔ لیکن راجن کے بڑھے ہوئے قدم نہ رُک سکے۔ ماں راجن کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"اپنی بوڑھی ماں کو یوں بلکتے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ میرے لال۔"

"میری ایک اور بھی ماں ہے ماں۔ جو تم سے بھی زیادہ بوڑھی ہے۔ جو تم سے بھی زیادہ دُکھی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ وہ بھی بازو پھیلائے مجھے چھاتی سے لگانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ کب سے میری راہ تک رہی ہے مجھے اب کچھ دن اس کی بھی سیوا کر لینے دو ماں۔"

اور راجن ایک ماں کو چھوڑ کر دوسری ماں کی سیوا کرنے ایک انجانی راہ پر چل دیا۔

راجن کو اسسٹنٹ انجینئر کی جگہ مل گئی۔ وہ دن رات محنت کرتا۔ جان توڑ کر کام کرتا۔ اُس نے اپنا تن من دیش کی سیوا میں لگا دیا۔ سب حیران تھے اتنی چھوٹی سی عمر اور اتنی قابلیت۔ بڑے بڑے تجربہ کار انجینئر اس کی لیاقت اور ذہانت کا لوہا ماننے لگے۔ اُس کے افسر کوئی بھی کام اُس کی رائے لئے بنا نہ کرتے تھے۔ ایک دن ڈویژنل انجینئر مسٹر ورما نے راجن کو بلایا اور کہا۔

"راجن ہمارا محکمہ پچھلے تین سالوں سے ایک بہت بڑی مشکل کا سامنا کر رہا ہے۔ ستارہ ندی کا پل ہمارے لئے ایک مصیبت بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔

پل بنانے کی ہماری ساری کوشش بے کار ثابت ہوئی ہیں۔ وہاں کی زمین اتنی گیلی اور نرم ہے کہ ہمیں بہت کوشش کرنے پر بھی ٹھوس زمین نہیں مل سکی جس پر پُل کو کھڑا کیا جا سکے۔ ایک دو بار پل بنایا بھی مگر وزن پڑتے ہی ٹوٹ گیا۔ مگر تمہاری محنت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے ہم سب کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ اب ستارہ پور کے لوگ بھی ضرور گاڑی پر سفر کر سکیں گے۔" مسٹر ورما نے ایک فائل راجن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی راجن تم ستارہ پور کے سب ڈویژن کے انجینئر بنا کر بھیجے جا رہے ہو۔"

یہ سنتے ہی راجن کے ہونٹ ایک بار کانپے مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ وہ کچھ بول نہ سکا اور فائل کو ہاتھ میں لئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

آج راجن بہت خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اُس کے سپنے آج پورے ہو رہے تھے۔ آخر وہ دیش کے کسی کام آ ہی گیا۔

اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا خوب بھیڑ جمع تھی - بڑی بڑی دور سے لوگ ستارہ ندی کا مکمل پُل دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے - بہت سے سرکاری افسر اور ایک بہت بڑے نیتا آج پُل کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے - سب لوگوں کی نظریں راجن پر لگی ہوئی تھیں - سبھی جانتے تھے کہ یہ راجن کی محنت کا ہی پھل تھا جو آج پُل کی شکل میں اُن کے سامنے کھڑا تھا -

راجن پُل کے نیچے کھڑا تھا - اوپر سے پہلی گاڑی گزرنے میں صرف دو منٹ باقی تھے - گاڑی آگئی - لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا - وہ سب راجن بابو کی جے - راجن بابو کی جے پکارنے لگے - گاڑی پُل کے اوپر سے گزر رہی تھی - اور نیچے کھڑا راجن پُل کی جانچ کر رہا تھا - راجن بابو کی جے - راجن بابو کی جے کے نعرے فضا میں بلند ہو رہے تھے - گاڑی ابھی بھی پُل کے اوپر سے گزر رہی تھی - راجن کی آنکھوں کے سامنے نرملا اور سادتری کے سسکتے ہوئے چہرے گھوم گئے راجن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - "مجھے معاف کر دیجئے پتا جی -" راجن انہیں میں کھو گیا -

اچانک بھیڑ میں شور مچ گیا - بچاؤ - بچاؤ لوگ چلانے لگے - مگر راجن کچھ نہ سُن سکا وہ تو اپنے ماں باپ کے قدموں میں سر رکھے اُن سے معافی مانگ رہا تھا -

پُل کے اوپر ایک دو بھے کے گارڈ کھڑے تھے - جن کو مزدور رسّے سے اُتار رہے تھے - اچانک رسّہ ٹوٹ گیا - گارڈ پُل کے نیچے جا گرا راجن کو

ایک جھٹکا لگا اور وہ زمین پر گر کر بیہوش ہو گیا۔

جب راجن کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ وہ اپاہج ہو چکا تھا۔ نریش اور ساوتری اس کے سرہانے بیٹھے رو رہے تھے۔ مسٹر ورما اور دوسرے افسر اس کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے تھے۔ باہر کھڑے لوگ اب بھی راجن بابو کی جے پکار رہے تھے۔

"پتاجی۔ مجھے معاف کر دیجئے، پتاجی۔" راجن کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جم گئے۔

"یہ کیا ہو گیا میرے بیٹے" نریش راجن کے جسم سے چمٹ گیا۔ ساوتری بیہوش ہو گئی۔

"آپ رو رہے ہیں پتاجی۔ آپ کو تو خوشی ہونا چاہیئے کہ آپ کا بیٹا دیش کے کام آیا۔ میں نے تو آپ کا نام روشن کیا ہے، پتاجی" راجن نے دیکھا سب کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"ہمیں اس حادثے کا سخت افسوس ہے راجن" مسٹر ورما اس کے آگے کچھ نہ بول سکے۔ الفاظ ان کے گلے میں ہی پھنس گئے۔

"نہیں مسٹر ورما۔ مجھے ان ٹانگوں کے کٹنے کا ذرا بھی افسوس نہیں۔ بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ میری ٹانگیں ماں کی سیوا کرتے کرتے کام آگئیں میں اپاہج ہو گیا تو کیا ہوا۔ میرا اپاہج دیش تو ذرا سیدھا ہو کر چلے گا۔ ترقی کی راہ پر تیزی سے بڑھے گا۔ میں جانتا ہوں میری یہ ٹانگیں میرے دیش کی کمزور لڑکھڑاتی اور کانپتی ٹانگوں کا سہارا بنیں گی۔ یہ تو صرف دو ہی ٹانگیں تھیں مسٹر ورما کاش یہ

ایک ہزار ہو تیں اور وہ اسی طرح دیش کی سیوا کرتے کرتے کٹ جاتیں ۔"

راجن پر بے ہوشی طاری ہونے لگی ۔ اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی ۔ باہر کھڑے لوگ اب بھی پکار رہے تھے راجن بابو کی جے ۔ راجن بابو کی جے ۔

راجن کے ہونٹ پھڑ پھڑائے

میرا بھارت ۔ میرے باپو کا بھارت"

اور ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئے ۔

سب کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے ۔ مگر راجن کے چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔

●●

عشق پر زور نہیں

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ نلوں میں پانی تک جم گیا تھا۔ کمرے کے فرش برف کی سلیاں جان پڑتے تھے۔ اخبار میں خبر تھی کہ گزشتہ سو سال میں بھی اس قدر سردی نہ پڑی تھی۔ انسان۔ حیوان۔ چرند پرند۔ اپنے اپنے ٹھکانوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔

ہوائی جہاز پالم کے ہوائی اڈے پر اترا۔ چند سواریاں یورپ سے آئی تھیں۔ غالباً سیاح تھے۔ ہندوستان کا موسم سرما ان کے لئے خوشگوار ہوتا ہے اس لئے عام طور پر سیر و تفریح کے لئے اس موسم کو ترجیح دیتے ہیں۔

ٹورسٹ کمپنیوں کی گاڑیاں منتظر کھڑی تھیں۔ ڈرائیور کاروں کے دروازے بند کئے سیٹوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ کمبل کو جسم کے گرد لپیٹ کر کبھی اپنے پیشہ کو کوستے اور کبھی مالکان کو برا بھلا کہتے۔ مگر نام دو گھونٹ پی آیا تھا۔ وہ

سردی کا مقابلہ کرنا خوب جانتا تھا ۔ اکثر کہا کرتا تھا۔

ماں باپ نہیں ۔ بہن بھائی نہیں ۔ اکیلی جان اور ڈرائیوری عمر بھر کنوارہ رہنے کا سرٹیفکیٹ تو مل چکا ہے کیوں نہ عیش کی اڑائی جائے ۔ تنخواہ جو لیتا ۔ انعام جو پاتا سب کا سب کھانے پینے میں ختم کر دیتا ۔ "پیسہ نہ رکھو کفن کو" کے مصداق اس کی جیب میں گنے ہوئے سکے ہی ہوتے ۔

کاروں نے یکے بعد دیگرے رینگنا شروع کیا اور اپنی سواریاں لے کر بھاگنے لگیں ۔ گرنام نے بھی سلف دبایا ۔ لیکن شاید وہ بھی سردی سے سکڑ گیا تھا ۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی ۔ گرنام کافی دیر سلف دباتا رہا ۔ کبھی چوک دیتا ۔ کبھی ایکسی لیٹر دباتا ۔ مگر بے سود ۔ وہ کار سے اترا اور ویٹنگ روم کی طرف بھاگا ۔ صوفہ سیٹ پر دو مسافر بیٹھے تھے ۔

" سلام صاحب " گرنام نے جاتے ہی سیلوٹ کی ۔

" سلام ؟ " صاحب نے جواب دیا ۔

" ڈرائیور ہا " " سر گاڑی سٹارٹ نہیں ہوتا ۔ انتظار کرنا مانگتا سر ۔ "

" او ۔ مائی ۔ گاڈ ۔ ڈیری ۔ ڈیر گولڈ ہیر " صاحب نے گرنام کی طرف دیکھ کر کہا ۔

" یس سر ۔ ابھی گاڑی لایا سر ۔ یہ کہہ کر گرنام واپس بھاگ آیا ۔ اس نے آتے ہی ہینڈل نکالا اور لگا کر گھمانے لگا ۔ اس کا جسم پسینہ سے تر بتر ہو گیا ۔ آخر گاڑی کو رحم آ گیا ۔ اور وہ پھک پھک کرنے لگی ۔ گرنام نے جلدی سے پسینہ پونچھا اور بھاگ کر صاحب کے پاس پہنچا ۔

"گاڑی ریڈی سر۔" گرنام نے جاتے ہی کہا۔

"ویری گڈ۔" صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں صوفے سے اٹھے۔ میم نے صاحب کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اور آہستہ آہستہ چل کر وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

"یہاں بہت ٹھنڈ ہوتا ہے! ڈرائیور۔" صاحب نے دریافت کیا۔

"ہاں سر۔"

"تمہیں سردی نہیں ہوتا شوفر۔" میم نے پوچھا۔

"کم لگتا سر۔ ہم دو گھونٹ پی لیتا۔ ٹھنڈک بھاگ جاتا۔" گرنام نے سٹیرنگ گھماتے ہوئے کہا۔

"ویری گڈ۔ ہمارے پاس خلاص ہو گیا...... یہاں ملتا۔" میم نے پوچھا۔

"ابھی چاہیئے سر؟"

"اب کہاں سے ملتا شوفر۔"

"ہمارے پاس سر۔"

"او۔ سر نہیں۔ میڈم۔" میڈم نے کہا۔

"ساری میڈم۔ ہم انگریزی کم جانتا۔ سر نہیں میڈم۔" میڈم کو ہنسی آگئی۔

گرنام نے دوسرے ہاتھ سے بوتل نکال کر میم کے آگے کر دی۔

"تھینک یو شوفر۔ تمہارا نام۔"

" گرنام سر۔ نہیں ۔ نہیں ساری میڈم

" تم بہت جالی ۔ ہم تم کو انعام دینا مانگتا ۔"

اور میڈم نے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر گرنام کو دے دیا۔

کار ہوٹل کے سامنے رُکی ۔ گرنام نے لپک کر دروازہ کھولا ۔ میڈم نے صاحب کا ہاتھ تھام لیا ۔ نیچے اترے اور ہوٹل میں چلے گئے۔

گرنام کی ڈیوٹی مسٹر ہاروڈ نے منیجر ہوٹل کو کہہ کر اپنے ساتھ لگوالی ۔ دہلی کی مشہور و معروف یادگاروں کے سیر کرانے کے بعد گرنام انہیں آگرہ لے گیا آگرہ سے بمبئی پھر کلکتہ ۔ دورانِ سفر گرنام نے ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ میڈم نے اسے دو نئے سوٹ سلوا کر دیئے ۔ ان کا رویہ اس کے ساتھ دن بدن اپنائیت کا تھا ۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ قدرت کی مہربانی سے کیسا خوش طبع اور سخی دل مسافر اسے ملا تھا ۔ اس کا دل دن بدن مسٹر ہاورڈ کی طرف کھنچا جا رہا تھا وہ جب بھی اسے دیکھتا اس کی آنکھوں میں مستی چھا جاتی ۔ جی چاہتا کہ دیکھتا ہی رہے ۔ اس پیکر حسن کو ۔ گرنام نے کئی بار دل سے پوچھا ۔

صاحب کی عمر پچاس پچپن سال کے لگ بھگ ہوگی ۔ اور میم صاحب کی مشکل سے بائیس سال ۔ کیا ان کے ملک میں شادی کے وقت عمر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔ ہمارے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا اور اگر کہیں ایسا ہوتا بھی ہے تو اُسے بُرا سمجھا جاتا ہے ۔

اور پھر سوال کیا ۔ گورنام ۔ تم آسمان پر اڑنا چاہتے ہو ۔ لیکن جانتے ہو

تمہارے پر نہیں - ڈرائیور ہو - اور وہ بھی نادار - تم خواب دیکھ رہے ہو - اس کا جو ہزاروں روپیہ خرچ کر کے سیر کر رہی ہے - تمہیں جس نے ہزار روپیہ بطور انعام دیئے - یہ بات چلا ہے کہ تم نوجوان ہو - خوبصورت ہو لیکن پڑھے لکھے تو نہیں نہ تم اس کی بات سمجھ سکتے ہو - اور نہ اپنی بات اُسے سمجھا سکتے ہو - کیوں مفت میں مصیبت مول لیتے ہو - "

گرنام نے دل پر پتھر رکھ لیا -

آگرہ میں جب وہ آئے اس دن پورا چاند تھا - تاج محل دیکھنے گئے - مسز ہاورڈ نے تاج کے متعلق دریافت کیا - تو گرنام نے آہ بھری اور کہا -

" یہ اس حسین بیگم کی یادگار ہے میڈم - جس کا ثانی اس دنیا میں نہ تھا - ایک دم خوبصورت تمہارے جیسی میڈم "

" ہمارے جیسا - "

" ہاں - ہاں - میڈم تم بھی بہت خوبصورت - "

" کیا نام تھا بیگم کا - گرنام ! "

" ممتاز ، بادشاہ شاہجہاں اسے بہت پیار کرتا تھا - جب بیگم مر گیا - شاہجہاں نے اس کی یاد میں یہ تاج بنوایا - "

" کیا تم بھی کسی سے پیار کرتا - گرنام " میڈم نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا -

" ہاں میڈم ہم بھی بہت لو کرتا - دل چاہتا اس کو دیکھتا ہی رہوں - لیکن میڈم ہم ڈرائیور اور وہ .... ! "

"کون ہے وہ؟ ہم تمہاری سفارش اس سے کرنا مانگتا۔"

"ہم نہیں بتائے گا میڈم۔ تم کو غصہ آجائے گا۔ ہم مرجائے گا۔"

مسز ہاورڈ مسکرادی۔ اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تم ایک دم اچھا گرنام۔ ایک دم۔"

"یہ تم کہتا میڈم۔"

"ہمارا دل کہتا۔ گرنام۔"

"جب تم یہاں سے جائے گا میڈم۔ ہم بھی بہت روئے گا۔"

"تم ایک دم پاگل۔ ہم ایک کے ساتھ نہیں رہتا۔ دل مانگتا چھوڑ دیتا۔ دوسرے کے ساتھ رہتا۔ جب چاہتا اس کو بھی چھوڑ دیتا۔ اور شادی کرتا۔ ہم ایک دم آزاد۔"

"تم پھر یہاں آئے گا میڈم۔"

"ہاں۔ اب ضرور آئے گا۔ پہلے امریکہ جائے گا صاحب کو چھوڑیگا۔ پھر واپس آئے گا۔ ہم کو ہندوستان بہت پسند آیا۔ تم پسند آیا۔ ایک دم نوجوان۔" اتنے میں مسٹر ہاورڈ آگیا۔ اور گرنام خاموش ہوگیا۔

گرنام بہت خوش تھا۔

چند دن دہلی رہنے کے بعد وہ واپس امریکہ جانے لگے۔ مسز ہاورڈ نے گرنام کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ اور وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گی۔

گرنام ہوائی اڈے پر بت بنا کھڑا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

مسز ہاورڈ نے دیکھا۔ پاس آئی۔

"تم روتا۔ دل چھوٹا کرتا۔ گرنام ہم وعدہ کرتا آتا۔ تمہارے لئے بہت روپیہ لاتا۔ تمہارے پاس اپنا گاڑی ہوتا۔ ہم تمہارے پاس رہتا۔ ہم اب تم سے ہنسنا مانگتا۔"

"جھوٹ تو نہیں بولتا میڈم۔ ہم انتظار کرے گا۔"

"ہم ضرور آئے گا۔ اور جلدی آئے گا۔ ہم تم کو روتا نہیں دیکھنا مانگتا۔ تم ہم کو بہت اچھا لگتا .... ہم اب جانا مانگتا۔"

اور ہوائی جہاز چلا گیا۔

گرنام واپس تو آیا۔ لیکن دل اس کا دل نہ تھا۔ اس نے کئی دن گاڑی نہ چلائی۔ خوب شراب پیتا رہا۔ اور میڈم کو یاد کرتا رہا۔ دن گزرنے لگے۔ اور گرنام بھی حسبِ معمول کام کرنے لگا۔ لیکن ہر روز ڈاک کے وقت وہ دفتر میں موجود ہوتا۔

ایک دن گرنام کے نام تار آیا۔ کلرک نے پڑھ کر بتایا۔

"مسز ہاورڈ کل شام ہوائی جہاز سے آ رہی ہے۔"

گرنام بہت خوش ہوا۔ کلرک نے خوشی کا سبب پوچھا۔ تو گرنام نے سیٹی بجاتے ہوئے جواب دیا۔

"بابو۔ ہم کل سے گرنام صاحب ہو جائے گا۔ ٹیکسی نہیں چلائے گا۔ اپنی گاڑی کا مالک ہوگا۔"

"یہ مسز ہاورڈ کون ہے؟" کلرک نے دریافت کیا۔

" ہمارا ہونیوالا وائف ۔" اور گرنام بھاگ گیا۔

گرنام ہوائی اڈے پر کئی گھنٹے پہلے ہی پہنچ گیا۔ اس دن وہ ٹیکسی ڈرائیور نہ تھا۔ بلکہ ٹیکسی کرایہ پر لے کر آیا تھا۔ اُس کی آنکھیں آسمان پر تھیں۔ اور دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ ہوائی جہاز آیا تو شام ہورہی تھی۔ گرنام بھاگ کر گیا۔ مسز ہاورڈ جلدی جلدی باہر آئی۔ گرنام سے ہاتھ ملائے۔ گرنام نے اچھا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔

" ہم آگیا گرنام ۔"

" ہم بہت خوش ہوا میڈم بہت خوش ۔"

" تم بہت اچھا گرنام ۔ ہم نے تمہیں بہت یاد کیا ۔"

" اب تو نہیں جائے گا میڈم !"

" اب ہم گرنام کو چھوڑ کر نہیں جائے گا ۔ تم ہمارا ......"

" رک کیوں گیا میڈم بولو کیا کہنا مانگتا ۔"

" تم ایک دم لو مانگتا ۔ پاگل کر دیتا ۔ ہم تھوڑا تھوڑا کرتا ۔"

" صاحب نہیں آیا میڈم ۔"

" صاحب کو چھوڑ دیا ۔ اب ہم یہاں رہے گا ۔"

گرنام کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ۔ دونوں رائل ہوٹل میں آگئے ۔ دن گزرنے لگے ۔ نوجوان دل دُنیا کو بھول گئے ۔ گرنام میڈم کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ۔ اور وہ بھی اس سے ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہ ہوتی ۔ میڈم روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی ۔

اور گرنام دُنیا و مافیہا سے بے خبر ایک نئی دُنیا کے خواب لے رہا تھا۔

اس طرح دو ماہ گزر گئے۔ میڈم جو روپیہ ساتھ لائی تھی وہ ختم ہونے لگا۔ ایک دن میڈم نے کہا:۔

"گرنام! اب ہم واپس جانا مانگتا ۔"

گرنام پر جیسے بجلی گر گئی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میڈم کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہو گیا تمہیں گرنام۔ ہم تمہیں ساتھ لے جانا مانگتا۔ اس طرح نہیں دیکھنا مانگتا"

اور گرنام نے میڈم کا ہاتھ چوم لیا۔

●●

خیر اندیش

ابھی پریم نے چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ کال بیل بجی۔ وہ بستر سے اٹھا۔ اور دروازہ کھولدیا۔ باہر ایک خوش پوش نوجوان کھڑا تھا۔

" آئیے تشریف لائیے۔"

اور وہ بغیر جواب دیئے اندر چلا آیا۔ پریم پلنگ پر بیٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ خوشپوش نے لپک کر پریم کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ اُس کا سر چکرانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر گر گیا۔ خوشپوش نے پریم کو پلنگ پر لٹا دیا۔ جلدی سے اپنا کام کیا۔ اور چلدیا۔ کچھ دیر بعد نوکر آیا۔ اس نے سمجھا۔ مالک چائے پی کر سو گئے ہیں وہ دوسرے کام میں مشغول ہو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد پریم کو ہوش آیا تو اُس نے خوشبوش کو وہاں نہ پایا۔ فوراً پلنگ سے اٹھا۔ بکس دیکھا جس کا قفل کھُلا پڑا تھا جلدی سے بکس میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن پرس جس میں اُس نے ایک لاکھ کے نوٹ رکھے تھے غائب تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔

نوکر کو آواز دی۔

"تم بازار سے کب آئے؟"

"آپ سو رہے تھے۔ مالک؟"

"یہاں کوئی اور آدمی تھا؟"

"نہیں مالک۔ البتہ گلی میں ایک نوجوان تیز قدم جاتا دیکھا تھا غالباً اسی طرف سے جا رہا تھا۔"

پریم نے پولیس کو اطلاع دینے کی غرض سے جونہی ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اس کی نظر میز پر پڑے کاغذ کے پرزے پر پڑی جس میں لکھا تھا۔

معاف کرنا مجھے روپیہ کی سخت ضرورت تھی، میں لئے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس کا رنج ہوگا۔ لیکن جس کے پاس لاکھوں ہوں اُسے ایک لاکھ سے کیا فرق پڑے گا۔ پولیس کو اطلاع دینا آپ کے لئے ہی نقصان دہ ہوگا۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا تھا۔ میری آنکھ ہمیشہ کالے بازار پر رہتی ہے۔ سفید مال پر نہیں۔

آپ کا خیر اندیش

پریم سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

پریم کا بیوپار لاکھوں کا تھا باپ کو مرے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں پریم کو جنم دے کر پرلوک سدھار گئی تھی۔ پریم جوانی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کئی ایک گھرانوں سے رشتہ آیا۔ لیکن نہ معلوم اُسے کیا دھن سوار تھی۔ کہ ہمیشہ ہی انکار کرتا رہا۔ وہ دولت اکٹھی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اُس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ چند سالوں میں اُس کا شمار کروڑ پتیوں میں ہو کر رہے گا۔ اس لیے جائز ناجائز طریقوں سے اپنے دھندے کو عروج پر پہنچانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

پریم زیادہ تر تنہائی پسند تھا۔ صرف ایک نوکر رکھا ہوا تھا...... کارخانہ چلاتا تھا۔ دفتر میں سٹاف بھی انگلیوں پر گنے کلرکوں پر مشتمل تھا۔ دو دو کلرکوں کا کام ایک کلرک سے لینے میں وہ عقلمندی سمجھتا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا۔ کہ موجودہ دور میں جب بے روزگاروں کی دُنیا میں کمی نہیں، ایک سو روپیہ ماہوار پر میٹرک پاس کیا بی اے پاس کلرک مل سکتے ہیں۔ کیوں نہ اُنکا کچومر نکالا جائے۔

لاکھ روپے کے چلے جانے کا رنج چند گھنٹے رہا۔ لیکن لے جانے والے کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

اب اُسے فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ بلیک کے باقی روپے کو کس طرح سفید کیا جائے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی کسی کی بھینٹ ہو جائے۔ غریب کلرکوں کے پیٹ کاٹ کر اکٹھی کی ہوئی دولت آن ناحدیں کوئی لے گیا۔

پریم کا اب کام میں دل نہ لگتا تھا۔ رات دن طرح طرح کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ نیند حرام ہو گئی دِن کا چین دولت نے چھین لیا۔ چہرے پر فکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

ایک دن اِس نے اپنے والد کے وقت کے منیم لالہ رام دھن کو بلایا۔ اور اس سے دل کی بات کہی۔

"لالہ رام دھن! تم پُرانے اور نمک حلال ملازم ہو تم جانتے ہی ہو کہ کچھ روپیہ تو لالہ جی بلیک کا چھوڑ گئے تھے اور کچھ اب کمایا ہے۔ اب زمانہ بہت نازک آگیا ہے۔ ہر ایک کی نظر اس طرف لگی رہتی ہے۔ تم کوئی راہ نکالو۔ جس سے یہ کالا روپیہ سفید ہو جائے"

لالہ رام دھن نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ جیسے وہ کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا ہو۔ پھر کہنے لگا۔

" یہ کونسی بڑی بات ہے، آپ فکر نہ کیجئے بابوجی چند دنوں میں ہی میں اس کا انتظام کر دوں گا"

پریم کی جان میں جان آئی " ذرا جلدی سوچ کر بتانا۔ لالہ رام دھن"

" بہت اچھا" اور رام دھن چلا گیا۔

وہ سوچنے لگا چند دن پہلے تو دونوں ہاتھوں سے اکٹھی کر رہے تھے۔ —— بابوجی۔ اب ......خیر......یہی وقت قسمت کے پلٹا کھانے کا ہوتا ہے۔

ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ رام دھن پریم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آپ نے پریم باغ تو دیکھا ہی ہوگا۔ دس ہزار گز میں ایک عالیشان کوٹھی اور باغ ہے۔ میں اس کے مالک سے ملا تھا۔ وہ فروخت کرنا چاہتا ہے۔"

"اِس طرح کی تو ہزاروں کوٹھیاں آئے دن فروخت ہوتی ہیں۔" فلاں رام دمن"

"ہاں۔ ہوتی ہیں۔ لیکن کالے کو سفید کرنے کا اس سے غنیمت موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" پریم نے حیرانگی سے پوچھا۔

"کوٹھی اور باغ کی قیمت پندرہ لاکھ ہے۔ لیکن رجسٹری میں صرف پانچ لاکھ لکھوایا جائے گا۔ آپ کا دس لاکھ روپیہ سفید ہو جائے گا۔"

"ہو تو جائے گا۔ لیکن کیا اُس کا مالک رضامند ہو جائے گا۔"

"کیوں نہیں وہ اس کالے دھندے میں ماہر ہے۔"

"تو دیر نہ لگاؤ۔ جلدی سودا کرو۔ اور اگر بیعانہ دینا ہو تو دے دیجئے۔"

رام دمن ایک لاکھ روپیہ بیعانہ دینے کے لئے لے گیا۔ اور سودا کر دیا۔ تیرہ لاکھ میں۔ لیکن رجسٹری صرف چھ لاکھ کی ہوگی۔ ایک لاکھ بیعانہ دیا۔ اقرار نامہ میں صرف دس ہزار لکھوا گیا۔ چند دنوں کے بعد مکان اور باغ کی رجسٹری ہو گئی۔ پریم بہت خوش تھا۔ رام دمن بھی خوش تھا۔ عمر بھر کی ملازمت میں وہ دس ہزار روپیہ اکٹھا نہ کر سکا تھا۔ لیکن ایک دن میں ہی وہ ایک لاکھ کا مالک ہو گیا تھا۔ اور جب اس نے بوڑھی دروپدی کے سامنے ایک لاکھ کے نوٹ رکھے تو پہلے تو وہ خوش ہوئی۔ لیکن اس کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔

صرف اتنا کہہ سکی۔

"بوڑھاپے میں کہیں جیل کی چار دیواری تو نہیں لکھی۔"

رام دھن بھی چند منٹوں کے لئے گہری سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے کہا۔ جو لوگ لاکھوں ہضم کر جاتے ہیں۔ وہ بھی تو اس جیسے ہی انسان ہیں۔

کروڑی شاہ نے جب تجوری میں چھ لاکھ بلیک کے رکھے۔ کالے روپے کا شمار کیا۔ تو مندوری کو کہنے لگا "صرف پانچ لاکھ کی کسر رہ گئی ہے۔ دو کروڑ میں بس پانچ لاکھ۔"

"ہاں۔ وہ بھی چند دنوں میں ہو جائے گا۔"

"اگر بمعہ سود کے مجھے چند دنوں کے بعد دے دیں تو میں آج ہی کسر پوری کر دیتی ہوں۔"

"وہ کیسے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ہی کالا بازار جانتے ہیں۔ میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ ابھی لاتی ہوں۔"

اور مندوری نے چند منٹوں میں نوٹوں کے بنڈل لا کر سامنے رکھ دیئے۔

"پورے پانچ لاکھ ہیں۔"

کروڑی شاہ نے نوٹوں کو اٹھا کر تجوری میں رکھا۔ تجوری کو قفل لگا چکا تھا کہ اُس کی نظر پاس ہی پڑے کاغذ کے ایک پُرزے پر پڑی۔ لکھا تھا۔ آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔ بلیک کا دو کروڑ اکٹھا کر لیا۔ اب میں لینے آیا

ہوں - اپنا حصہ - آپ کو رنج تو ہو گا - لیکن چند لاکھ کم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا - میری آنکھ ہر وقت کالے دھن پر رہتی ہے ۔ 'آپ کا خیر اندیش'

کروڑی شاہ کے اوسان خطا ہو گئے، مندوری کے پوچھنے پر صرف اتنا کہا۔

"دنیا کی نظروں میں' میں کانٹا بن گیا ہوں - جیسے کسی کے باپ سے لیا ہے۔ کمایا ہے - میں نے۔

میں بھی دیکھتا ہوں کس طرح لے جاتا ہے - چھٹی کا دودھ نہ یاد کرا دیا تو کہنا - میرا نام بھی کروڑی ہے کروڑی۔"

اور وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا - جانے سے پہلے اس نے تجوری کے قفل کو اچھی طرح سے دیکھا - پھر کمرہ کے قفل کو دوبارہ اچھال کر تسلی کی اور جاکر پلنگ پر لیٹ گیا۔

خیال آیا اس قدر روپیہ - کوئی اولاد نہیں - موت کی دہلیز پر کھڑا ہو کر خوش ہو رہا ہوں - میں ساتھ تو لے جانے سے رہا - ہاتھ سے کسی کو دے نہ سکا - رشتہ دار میری موت پر لڈو بانٹیں گے - اور اس دولت کو جس طرح چاہیں گے اڑائیں گے۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور سو گیا - صبح جب بیدار ہوا سب کچھ بھول چکا تھا - اٹھتے ہی اس نے تجوری کو دیکھا - جس کا قفل کھلا تھا - اس کی ہوائیاں اڑ گئیں - روپیہ شمار کیا - صرف پانچ لاکھ کم تھے۔

تجوری کے پاس کاغذ کا پرزہ تھا - لکھا تھا - میں صرف پانچ لے جا رہا ہوں - ایک سو پچانوے چھوڑے جا رہا ہوں - پولیس کو رپورٹ دے کر اپنے

آپ کو پھنسانے کی کوشش نہ کرنا۔

'آپ کا خیر اندیش'

کروڑی شاہ نے سر تھام لیا۔۔ اور پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھا۔ اور بندری کو کہنے لگا۔

"کہاں سے آئے تھے وہ پانچ لاکھ؟ جو چند سنٹ بھی تجوری میں نہ رہ سکے۔ شکر ہے کہ وہ اپنے ساتھ اور نہ لے گئے"

"ہائے میں مر گئی۔ کون لے گیا؟"

"ہاں کوئی لے گیا۔ بہت شریف نکلا۔ صرف پانچ ہی لئے اُس نے"

پریم نے لالہ رام دھن کی زبانی یہ خبر سُنی۔ اُس نے نہ تو خوشی ظاہر کی نہ ہی رنج۔ البتہ اُس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب وہ کبھی بھی کالا دھندہ نہیں کرے گا۔

شہر میں کالے بازار امدادی فنڈ کا عام چرچا تھا۔ اور وہ لوگ جو زندگی سے تنگ آچکے تھے رات کو پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوتے تھے۔ بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے تھے۔ اور اپنی قسمت کو بیٹھ کر رویا کرتے تھے۔ جوق در جوق امدادی فنڈ کے دفتر میں جانے لگے اور ماہواری الاؤنس پانے لگے۔

لالہ کروڑی شاہ نے کالے بازار امدادی فنڈ کا اشتہار پڑھا۔ جس میں لکھا تھا۔" یہ فنڈ ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ماہوار آمدنی کم ہے۔ گھر کا خرچہ نہیں چلا سکتے۔ ایک بالغ کے لئے کم از کم پچاس روپے ماہوار اور

کم عمر والے کے لئے تیس روپے ماہوار کے حساب سے کنبہ کی آمدنی ہونی ضروری ہے۔ اور جس کنبہ کی اس سے کم آمدنی ہے وہ تب تک کالے بازار امدادی فنڈ سے امداد حاصل کرسکتا ہے۔ جب تک کہ اس کی آمدنی اس تناسب سے نہیں ہوجاتی۔

لوگوں سے چندہ دینے کی بھی اپیل ہے۔ منیجر خیراندیش

لالہ کروڑی شاہ نے اس اشتہار کو کئی بار پڑھا۔ خیراندیش پڑھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ دکان بند کر کے شام کو امدادی فنڈ کے دفتر گیا۔ اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے سرپرست کئی ایک اعلیٰ حیثیت کے آدمی ہیں تو اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ تمام روپیہ چلا جائے اور ساتھ ہی جیل کی چاردیواری بھی نصیب ہو۔ وہ رات بھر سوچتا ہی رہا۔

صبح بیدار ہوا تو سورج کے طلوع ہوتے ہی جس کا دماغ بھی روشن ہوگیا، اس نے فیصلہ کرلیا کہ کالے بازار سے اکٹھا کیا ہوا روپیہ وہ امدادی فنڈ میں دے کر سفید کرے گا۔

چنانچہ اس نے تجوری کا قفل کھولا اور تمام کا تمام روپیہ ایک تھیلے میں ڈال کر چل دیا۔

مندوری نے پوچھا۔

"کہاں جارہے ہو یہ تمام روپیہ لے کر؟"

"آج ہی تو آنکھ کھلی ہے مندوری۔ اپنے جیتے جی ان لوگوں میں بانٹنے

جارہا ہوں، جو دو وقت کی روٹی کے محتاج ہیں مرنے کے بعد لوٹی جانے والی دولت کو اپنے ہاتھوں دینے جارہا ہوں۔

کروڑی شاہ جب دفتر امدادی فنڈ میں داخل ہوا تو منیجر کے چہرہ پر مسکراہٹ آگئی۔

"آئیے آئیے رائے صاحب فرمائیے۔ کس طرح آنا ہوا۔ کیا کسی غرض مند کو امداد دلانے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔"

"نہیں۔ میں یہ دینے آیا ہوں۔" اور کروڑی شاہ نے تھیلہ بڑھا دیا۔ منیجر نے دیکھا۔ پورے ایک کروڑ پچانوے لاکھ کے نوٹ تھے۔ وہ مسکرانے لگا۔

"لالہ جی۔"

اور منیجر نے باقاعدہ رسید کاٹی۔ لالہ کروڑی شاہ نے لینے سے انکار کیا تو منیجر نے کہا "اس میں آپ کا نام نہیں لکھا گیا۔ لالہ جی میں جانتا ہوں کہ یہ روپیہ کالے بازار کا ہے اور آپ کے لئے چندہ دینا مصیبت کا موجب ہو سکتا ہے اس لئے جو رسید ایسے روپے کی کاٹی جاتی ہے۔ اس میں کسی کا نام درج نہیں ہوتا۔"

لالہ کروڑی شاہ نے رسید وہیں پر چاک کر دی۔ اُس کے دماغ سے بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر جوانی عود کر آئی تھی۔

پریم حسبِ معمول صبح کی چائے نوش کر رہا تھا کہ گھنٹی بجی۔ اس نے نوکر کو آواز دی۔

نوکر نے دروازہ کھولا ۔ خوش پوش نوجوان کو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ بابو جی کو ملنے آیا ہے کہا ۔

" بابو جی گھر پر ہی ہیں "

نووارد کمرے میں داخل ہوا اور جب اس نے نمستے کی تو پریم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں

" گھبرائیے نہیں ۔ مسٹر پریم ۔ آج میں اس نیت سے نہیں آیا " اور اس نے پرس نکال کر میز پر رکھ دیا ۔

" یہ لیجئے ۔ آپ کا ایک لاکھ بمع سود ۔ میں لوٹانے آیا ہوں ۔ اس دن کالے بازار امدادی فنڈ کو چلانے کے لئے ضرورت تھی لے گیا تھا ۔ اب آپ نے سیدھی راہ اختیار کر لی ۔ اور ہمارے پاس لاکھوں آ گئے ۔ اس لئے آپ انہیں سنبھال لیجئے ۔ میں خیر اندیش ہوں "

پریم نے خیر اندیش کو دیکھا ۔ جو مسکرا رہا تھا ۔

پریم نے یہ کہتے ہوئے پرس واپس کر دیا ۔

" خیر اندیش صاحب ۔ میں اس روپیہ کو بھول چکا ہوں ۔ آپ براہ مہربانی اس روپیہ کو کسی نیک کام پر صرف کر دیجئے ۔ آپ کا اتنا احسان کیا کم ہے کہ آپ نے مجھے اس فکر سے نجات دلا دی ۔ آج آپ ایک نئے پریم سے مل رہے ہیں ۔ میں نے اب وہ دھندا چھوڑ دیا ہے ۔ آپ تو کالے بازار امدادی فنڈ کھول کر کماتے ہوں

کی امداد کر رہے ہیں۔ اور میں اپنے سٹاف کو جن کی تنخواہیں کسی وقت بہت ہی قلیل تھیں۔ ترقی۔ بونس۔ پراویڈنٹ فنڈ کی سہولیت دے کر اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اب میں کس قدر خوش ہوں۔ کچھ نہ پوچھئے۔ خیر اندیش صاحب۔"

"معاف کرنا میں خیر اندیش صرف کالے بازار والوں کے لئے ہوں۔ دوسروں کے لئے صندیال ہوں

منزل دور نہیں

گوری ہر روز کی طرح آج بھی آکر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کی اداس اور پریشان نظریں دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں اور پہاڑوں میں بڑی بے چینی سے اس کو تلاش کرنے لگیں، مگر میدان اور پہاڑ آج بھی ہر روز کی طرح سونے اور ویران تھے۔ میدانوں پر بل کھاتی اور پہاڑوں کی آغوش میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈیاں گوری ہی کی طرح راہی یا کسی ساتھی کے انتظار میں آج بھی اداس تھیں، ویران تھیں، سنسان تھیں۔ گوری کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کا دل بجھ گیا۔

کیا آج بھی منگل نہیں لوٹے گا۔ کیا اب کبھی اس کا گھر نہ بنے گا۔ کیا اس کے سارے سپنے ادھورے ہی رہ جائیں گے۔ کیا وہ ساری عمر اب اسی طرح انتظار ہی کرتی رہے گی۔

گوری بے چین ہو اٹھی۔ اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے۔

"یہ جُدائی اب مجھ سے نہیں سہی جاتی منگل" اور دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گوری کی آنکھوں سے نکل کر اُس کے لال لال گالوں پر لڑھک گئے۔ کیا منگل نے اُسے دھوکہ دیا۔ اُس سے جھوٹے وعدے کئے، اُس سے بناوٹی پیار کیا۔ کیا منگل اب سچ مچ کبھی نہیں لوٹے گا۔ گوری کا سارا جسم کانپ اٹھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف گھورنے لگی۔ اور پھر یکایک چیخ اٹھی "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ منگل ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا" گوری کی آنکھوں کے سامنے منگل کا مسکراتا ہوا چہرہ ناچنے لگا۔ اُس کے آخری الفاظ گوری کے کانوں میں ایکبار پھر گونجنے لگے۔

"تم دل ہلکا نہ کرو گوری۔ میں جلد ہی واپس لوٹ کر آؤں گا۔ آج ہمارے ملک پر ایک دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ ہمیں اُس کا منہ توڑ جواب دینا ہے۔ اُس کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنانا ہے۔ اُس کو ایسا سبق سکھانا ہے کہ وہ پھر دوبارہ ایسی حماقت کرنے کی جُرأت نہ کر سکے۔ تم نہیں جانتی گوری کہ اگر دشمن جیت گیا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہمارے گھر بار مٹی میں ملا دیئے جائیں گے۔ ہماری ماؤں بہنوں کی عزت دن دہاڑے لوٹ لی جائے گی۔ ہمارے بچے سنگینوں پر چڑھا دیئے جائیں گے۔ زندگی سے جھکتی ہوئی یہ بستیاں ویران ہو جائیں گی اور ہندوستان کا بلند سر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیچے جھک جائے گا۔ اس کی آن بان اور شان سب خاک

مل جائے گی۔ مگر میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گا گوری۔ دھرتی ماں کی قسم دشمن کے ایک ایک آدمی کو گولی سے بھون دوں گا۔" اور یہ کہتے کہتے منگل کا چہرہ لال ہو اٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تھے۔ اُس کی انگلیاں بڑی بے چینی سے بندوق کے گھوڑے پر ناچنے لگیں تھیں۔ گھوڑا دب گیا۔ بندوق چل گئی۔ گولی ہوا کے سینے کو چیرتی ہوئی کسی پہاڑ کی چوٹی سے جا ٹکرائی۔" گنگا مائی کی قسم گوری جو آنکھ بھی ان پہاڑوں کی طرف اُٹھے گی اُس کو نکال دوں گا۔ جو قدم ان کی طرف بڑھے گا کاٹ دوں گا۔ یہ بلند چوٹیاں صدیوں سے ہماری حفاظت کرتی آئی ہیں۔ آج ہمیں ان کی حفاظت کرنی ہے آج تک یہ لمبے چوڑے پہاڑ ہمیں دشمن سے بچاتے آئے ہیں۔ آج ہمیں انہیں دشمن سے بچانا ہے گوری۔"

گوری یہ سب سُن رہی تھی اور سُن کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ گاؤں کی ایک ان پڑھ گنوار، بھلا یہ سب کیا سمجھے۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ منگل اُس سے بچھڑ رہا ہے اُس کو چھوڑ کر کہیں دُور جا رہا ہے۔ کسی سے لڑنے کے لیئے جہاں اُس کی جان کا خطرہ ہے۔ گوری منگل کو کوئی جواب نہ دے سکی تھی اور صرف اس کے سینے سے لپٹ کر رہ پڑی تھی۔

اس دُنیا میں تم ہی ایک میرے سہارے ہو منگل۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی اور کہاں جاؤں گی۔ کس کے سہارے اتنا لمبا چوڑا جیون گزاروں گی۔" اور گوری سسک پڑی تھی۔

"نہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا گوری تم یقین رکھو۔ میں جیتا جاگتا تمہارے

پاس واپس لوٹوں گا۔ اور آتے ہی تم سے بیاہ کر لوں گا۔ اور پھر ہم دونوں اسی پہاڑ کی گود میں ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے جہاں ہمارے بچے ہوں گے اپنے ان کھیتوں میں ہل چلائیں گے جہاں ہری بھری کھیتیاں لہلہائیں گی۔ اور ہم سُکھ چین کی زندگی گزاریں گے۔ تب کوئی بھی ہمارے اُس گھر کو برباد کرنے نہیں آئے گا۔ ہمارے سُکھ چین کو لوٹنے نہیں آئے گا۔ تم تھوڑا سا انتظار کرو گوری۔ بس تم اسی جگہ پر انتظار کرنا اور میری راہ دیکھنا۔ تمہارا پیار اور تمہاری محبت مجھے ضرور زندہ واپس لائے گی گوری۔"

اور یہ کہہ کر منگل گوری سے جدا ہو گیا تھا۔ گوری یہیں بیٹھی بیٹھی اُسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے دل پر پتھر رکھے —— اور گوری ایک سال سے اسی طرح آنکھوں میں آنسو بھرے اُس کے لوٹنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ پھر ہر شام وہ اُداس اور مایوس ہو کر لوٹ جاتی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ گوری کا دل بھی اندر بیٹھنے لگا۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ بدن کانپنے لگا۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ منگل آج بھی نہیں آیا۔ کیا آج بھی وہ اکیلی ہی گھر واپس لوٹے گی۔ گوری کی امیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے بجھنے لگے۔ گوری کا دھیرج ٹوٹ گیا۔ اب وہ زندہ رہ کر کیا کرے گی۔ منگل کے بنا یہ زندگی کس کام کی۔ وہ بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ گوری اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پہاڑ کی بلند چوٹی سے نیچے جھانکا گہرے اندھیرے

کے علاوہ اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ بھی اپنے آپ کو اس اندھیرے میں کھو دے گی۔
گوری نے آنکھیں بند کرلیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا، اُس کا ایک پاؤں زمین سے
اور جسم آگے کی طرف جھک گیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے "منگل" اور
اُس کا دوسرا پاؤں بھی آہستہ آہستہ چٹان کی پتھریلی زمین سے اُٹھنے لگا۔
تبھی اچانک اُس کے کانوں سے کسی کی مدھم سی آواز ٹکرائی۔ گوری ایک
ہی جھٹکے میں پیچھے جا پڑی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُس آواز کو ایکبار پھر
غور سے سُنا۔ اور خوشی سے چلا اُٹھی "منگل" اس نے دیکھا دور بہت دور
پہاڑ کے اوپر ایک کالا سا ریچھ اس کی طرف بڑھتا آرہا ہے۔ خوشی سے پاگل،
کسی سے ملنے کی آس میں دیوانہ۔ مستی میں گنگناتا ہوا۔ منگل کی آواز اب گوری
کو صاف سُنائی دے رہی تھی۔ "دھیرج رکھو تو ضرور اب منزل دُور نہیں" گوری
سمجھ گئی۔ وہی تو منگل کی منزل تھی۔ گوری کسی پتھر کی طرح لڑھک کر پہاڑ کے نیچے
اُتر گئی۔ کئی جگہ چوٹیں آئیں اور خون بہنے لگا۔ مگر اُسے کچھ بھی ہوش نہ تھا۔ گوری
ہوا کی طرح اڑنے لگی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر۔ وہ جلدی
سے جلدی منگل کے لمبے چوڑے سینے سے چمٹ جانا چاہتی تھی۔ اُس کی آغوش
میں سو جانا چاہتی تھی۔

منگل نے گوری کو اپنی پیاسی آغوش میں دبوچ لیا۔ گوری سسک اُٹھی۔
"تم نے کتنی دیر لگادی منگل" منگل نے گوری کا چہرہ اوپر اُٹھایا اور اُس
کے آنسو پونچھ دیئے۔

"اب تمہارا منگل کبھی تم سے جدا نہیں ہو گا گوری"

"منگل" گوری بلک پڑی۔

"ہاں سچ میں ہوں گوری۔ اب مجھے پھر کبھی نہیں جانا پڑے گا۔ ہم نے دشمن کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفایا کر دیا ہے گوری۔ وہ گیدڑ کی طرح بھاگ گیا۔ اور ہم جیت گئے گوری" گوری منگل سے چپٹے ابھی بھی سسک رہی تھی اور منگل کہے جا رہا تھا؛ "اب ہمارے گھر دل کو برباد کرنے کوئی نہیں آئے گا گوری۔ کوئی لٹیرا ہماری محنت کی کمائی ہم سے چھیننے نہیں آئے گا"

گوری اور منگل آہستہ آہستہ پہاڑ کی اسی چوٹی پر پہنچ گئے۔ جہاں ایک سال پہلے وہ جدا ہوئے تھے۔

"اب ہم اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے گوری۔ جہاں تم رہو گی میں رہوں گا اور ہمارے بچے رہیں گے" گوری نے دیکھا سچ مچ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت سا گھر کھڑا تھا جس کے آنگن میں ننھے ننھے بچے کھیل رہے تھے اور منگل بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ گوری کو اپنے سپنے پورے ہوتے دکھائی دینے لگے۔ نہ جانے گوری اور منگل کتنی دیر گم سم اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ایک دوسرے سے لپٹے وہاں کھڑے رہے۔ اچانک گاؤں کے کسی کونے سے کتے بھونکنے کی آوازوں نے انہیں چونکا دیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ صرف سامنے پہاڑی کے اوپر شنکر بابا کے مندر میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ منگل نے گوری کی آنکھوں میں جھانکا۔ گوری نے منگل کی آنکھوں میں

کچھ پڑھا۔ اور وہ سب سمجھ گئی۔ شرم سے اس کے گال لال ہو گئے اور منگل آج اپنا پہلا وعدہ پورا کرنے چل پڑا۔ گوری کے کانوں میں منگل کے کہے ہوئے الفاظ ایک بار پھر مندر کی شریلی گھنٹیوں کی طرح بج اُٹھے۔

"میں آتے ہی تم سے بیاہ کر لوں گا گوری"

منگل اور گوری اُبھرے اُبھرے اُس روشنی کی طرف چل پڑے۔ منگل پھر گنگنانے لگا" آکاش سے صدا آئی۔ اب منزل دور نہیں" مگر اب اس کی منزل اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی

●●

ادھورے سپنے

مالا چاند کا ٹکڑا تھی ۔ خوبصورتی کی جیتی جاگتی تصویر دھرتی پر اُتر آئی تھی ۔ اُس کی مسکراہٹ دلوں پر بجلیاں گراتی ۔ اُس کی بل کھاتی زلفیں چلتے قدم باندھ دیتیں ۔ مُرجھائے دل کھل اُٹھتے ۔ جہان کا سارا حُسن شاید سمٹ کر اُسی میں سما گیا تھا ۔ اور یہ سب مالا سے چھپا نہ تھا ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک نظر قیامت برپا کر سکتی ہے ۔ لاکھوں سر خم کر سکتی ہے ۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اپنی زلفوں کا جوڑا باندھتی ۔ اُس میں گلاب کا پھول لگاتی ۔ اپنے پورے جسم کو اوپر سے نیچے تک دیکھتی تو خود ہی شرم سے مر مر جاتی ۔ اس کی آنکھوں میں مستی چھا جاتی ۔ اپنے بدن کی گرمی سے خود ہی جلنے لگتی تو وہ گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی اور بند آنکھوں میں سپنے دیکھتی ۔

اُس نے ایک بہت ہی قیمتی ساڑھی پہن رکھی ہے اور اس کے ساتھ

ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہے۔ جس کا ایک ہاتھ مالا کی کمر میں پڑا ہے۔ کار بڑی تیزی سے کناٹ پلیس میں دوڑ رہی ہے اور وہ نوجوان مالا سے کہہ رہا ہے:" مالا تم اس دھرتی کی عورت نہیں کوئی اپسرا ہو۔ جس کی آغوش میں تم ہو وہ آسمان کے دیوتاؤں سے بھی زیادہ خوش نصیب ہے " مالا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور وہ اپنا سر نوجوان کے بازو پر رکھ دیتی ہے۔

جیسے اچانک کار کو بریک لگ جائے اور مالا کے سنہری سپنے بکھر جاتے۔

وہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتی تو اس کا جسم کانپ اٹھتا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ سامنے کیل پر لٹکتا ہوا رام ناتھ کا کوٹ اس کی آرزوؤں کا خون کر دیتا۔ اُسے ایسا لگتا جیسے وہ زمین کے اندر دھنستی جا رہی ہے اُس کا تپتا ہوا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے۔ اس کے لال لال گال پچک رہے ہیں۔ اس کی سرمئی آنکھوں کے چاروں طرف گہرے گہرے گڑھے پڑ رہے ہیں۔ اُس کا آگ کی طرح جلتا ہوا بدن برف کی طرح ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔

کوٹ کے اندر بڑے بڑے سوراخ اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ اور وہ گھبرا کر پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ اور چیخ اٹھتی۔

" نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے۔ ایک سپنا ہے۔ مگر یہ جھوٹ نہ تھا۔ سچ تھا۔ ایک حقیقت تھی۔ رام ناتھ ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ سب مل ملا کر ۵۰۰ روپے ملتے تھے۔ گھر میں کھانے والے آٹھ آدمی تھے۔ ۴ لڑکیاں۔ دو لڑکے، رام ناتھ اور پاربتی۔ سبھی بچے پڑھتے

تھے۔ مالا سب سے بڑی تھی۔ اور بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ رام ناتھ اپنا اور پاربتی کا پیٹ کاٹ کر بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ جو کوٹ وہ آج پہن رہا تھا وہی اُس نے ۲۲ سال پہلے اپنی شادی کے دن پہنا تھا اسے اپنی شادی کے وہ سنہرے دن آج تک نہیں بھولے تھے۔ کتنا جچتا تھا وہ اس کوٹ میں اُس وقت مگر اب وہی کوٹ رام ناتھ کی طرح اپنے آپ سے تنگ آچکا تھا، شاید اسی لئے چند مہینے کے اندر ہی اندر اُس میں اتنے بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے کہ سردیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بڑی آسانی سے رام ناتھ کے بدن کو شن کر سکتی تھی۔ اور انہیں چھ مہینوں میں ہی رام ناتھ کے کالے سیاہ بال بھی تو بالکل سفید ہو گئے تھے۔ اس کے ابھرے گال اندر کو دھنس گئے تھے۔ کمر جھکی جا رہی تھی۔ رات کو کھانستے کھانستے سارے گھر والوں کو پریشان کر دیتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح جیئے جا رہا تھا۔

مالا کے امتحان ختم ہو گئے۔ نتیجہ نکلا۔ اور مالا اوّل درجے میں پاس ہو گئی۔ تمام گھر والے خوش تھے۔ رام ناتھ بھی خوش تھا۔ شاید اُس کی جھکی کمر اب کچھ سیدھی ہو جائے۔ پچکی ہوئی گالیں کچھ باہر آجائیں۔

اور مالا۔

اُس کی خوشی کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ وہ ساری رات سو نہ سکی۔ جاگتی رہی۔ ہرے، نیلے، پیلے اور سفید رنگ کی کاریں ساری رات اس کی آنکھوں کے سامنے دوڑتی رہیں۔ قیمتی زری۔ سلک اور شانتی نکیتنی کی

ساڑھیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے اُڑنے لگیں۔

ریگل۔ پلازہ۔ اور اوڈین کی بلڈنگیں اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

دیوانند۔ راج کپور۔ اور شمی کپور کے چہرے اُسے اپنے اوپر جھکے دکھائی دیئے۔ اور وہ یہ سب دیکھ کر مسکراتی رہی۔

تعلیم کے سامنے جھکے نہ جھکے لیکن حسن کے آگے دنیا ضرور جھکتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ صدیوں سے سنتے چلے آرہے ہیں اور شاید آنے والی نسلیں بھی ایسا ہی سنیں گی۔ مالا نے جہاں بھی نوکری کے لئے درخواست دی لوگوں نے سر خم کر دیا ہے۔ حسن کی دیوی کو بھلا کون ٹھکرائے۔ سب سے پہلے ہر جگہ اسی کا نمبر آیا۔ کوئی چار سو دے رہا تھا کوئی چھ سو اور کوئی آٹھ سو۔ کس کی مانے۔ کس کو ٹھکرائے۔ سیدھا سادھا رام ناتھ بھی خوش تھا کہ چلو بیٹی کی تعلیم کی قیمت تو پڑی۔ آخر مالا کچھ کم نہیں پڑھی۔ بی۔ اے پاس کیا ہے۔ مگر اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ اگر مالا میٹرک بھی نہ ہوتی۔ تب بھی اُسے آٹھ سو روپے مہینہ آسانی سے مل سکتے تھے۔ ایسی تعلیم کی بات تو وہ خود اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ ایم۔ اے پاس امر اُس کے دفتر میں کلرک ہے۔

بڑی سوچ بچار کے بعد مالا نے فلور ڈارا چلوا اڑ اینڈ امپورٹر کے آفس میں جنرل منیجر مسٹر شرما کی پرائیویٹ سیکرٹری کے لئے ہاں کر دی۔ آٹھ سو روپیہ مہینہ اور آنے جانے کے لئے مسٹر شرما کی کار۔ گھر والے بڑے خوش ہوئے۔ رام ناتھ بھی خوش تھا۔ اب اس کے اچھے دن آنے والے تھے۔ اسی دن کے لئے تو اس نے اپنی ہر ضرورت کو ٹھکرا کر مالا کو تعلیم دلوائی تھی۔

رام ناتھ کو امر سے کچھ انس ہو گیا تھا بے شک وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ لیکن تھا بڑا ذہین اور ہونہار۔ رام ناتھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ لڑکا مزید اونچا اٹھے گا۔ ترقی کرے گا۔ اسی لئے وہ اسے بڑا پیار کرتا تھا۔ اُس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جب سے مالا نے بی۔اے پاس کیا تھا کئی بار رام ناتھ نے امر اور مالا کے بارے میں سوچا تھا۔

"جوڑی اچھی رہے گی۔" اور کئی بار یہ لفظ دل ہی دل میں کہہ بھی چکا تھا۔

امر رام ناتھ کے گھر والوں کے لئے کوئی اجنبی نہ تھا۔ وہ کئی بار اُن کے گھر آچکا تھا۔ کبھی کوئی فائل لینے۔ کبھی بیمار رام ناتھ کو چھوڑنے۔ اُس نے مالا کو بھی دیکھا تھا۔ اور مالا نے اُس کو کئی بار دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک دوسرے کے دل کو ٹٹولا۔ اور ایک دوسرے کو پرکھنا چاہا مگر دونوں ہی کچھ نہ سمجھ سکے۔ امر نے کئی بار چاہا کہ وہ مالا سے کہے کہ وہ اُس کی پوجا کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب بھی وہ مالا کے سامنے آتا اُس کے ہونٹ کبھی نہ کھل سکتے اور وہ خاموش رہ جاتا۔

مالا نے بھی امر کی آنکھوں کو پڑھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں کو سُنا۔ مگر سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ انجان بن جاتی۔ اُس نے بھی کتنی ہی بار امر کے بارے میں سوچا تھا۔ امر نوجوان ہے۔ خوبصورت ہے۔ اُسے پیار کرتا ہے۔ اُس پر اپنی جان نچھاور کر سکتا ہے۔ مگر اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے اور سفید رنگ کی کاریں دوڑنے لگتیں۔ رنگ برنگی قیمتی ساڑھیاں ہوا میں اُڑنے لگتیں اور وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ

رکھ دیتی۔

مالا کے آنے کی خوشی میں مسٹر شرما نے سارے آفس کو پارٹی دی۔ اور اس کے بعد پھر روز پارٹیاں ہونے لگیں۔ کبھی جیرڈ میں تو کبھی گے لارڈ میں۔ کبھی امپیریل میں تو کبھی اشوکا میں۔ مالا بہت خوش تھی۔ اُس کی آرزوئیں پوری ہو رہی تھیں۔ اُس کے سپنے حقیقت میں تبدیل ہو رہے تھے۔ وہ ہر شام مسٹر شرما کے ساتھ کار میں بیٹھتی۔ مسٹر شرما کار ڈرائیو کرتے اور مالا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے " مائی سویٹ مالا " اور مالا سچ مچ شرما جاتی۔ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن جاتی۔ مسٹر شرما کتنی ہی قیمتی ساڑھیاں مس مالا کو خرید کر دے چکے تھے اور وہ کئی بار ان کے بنگلے پر بھی جا چکی تھی۔ وہ دن بدن مسٹر شرما کے احسانوں تلے دبتی جا رہی تھی۔ زندگی بڑی رنگین تھی۔ راہ انجانی تھی۔ لیکن وہ بے خبر آنکھیں بند کئے اُس پر بھاگی جا رہی تھی۔ مگر اچانک ایک دن اُس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ ایسی گری کہ سنبھل نہ سکی۔ اُس کے سپنے ٹوٹ گئے اُس کے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک گہرے گڑھے میں گر چکی تھی اور مسٹر شرما اُسے چھوڑ کر کہیں دور جا چکے تھے۔ اُس کے ارد گرد ڈراؤنی اور بھیانک شکلیں ناچنے لگیں۔ وہ سہم گئی۔ وہ شکلیں اُس کی کانوں میں چیخنے لگیں۔ " تم نیچ ہو۔ بدکار ہو۔

" نہیں۔ نہیں۔ مجھ سے دھوکا ہوا ہے۔ " وہ چلا اُٹھی۔

" تم نے جان بوجھ کر دھوکا کھایا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ " اُس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اُسے کوئی سہارا نہ ملا۔ وہ اندھیرے میں ہی رینگنے لگی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا۔ ایک سایہ اُس کی طرف گھور رہا تھا۔ سایہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ڈر گئی اور تیزی سے دوڑ پڑی۔ اچانک اُس کے پاؤں تھک گئے۔ سامنے ایک بہت بڑا دریا تھا۔ لہریں اچھل رہی تھیں۔ اور اونچی اونچی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "راہ کتنی رنگین تھی۔ اور منزل کتنی بھیانک" ۔۔۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں دھرتی سے اُٹھنے لگے۔ اُس کا جسم دریا کی طرف جھکنے لگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تبھی کسی نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُس کا سر کسی کے دھڑکتے سینے سے چمٹ گیا۔ "تمہاری منزل وہ نہیں یہ ہے مالا" مالا نے سر اُٹھا کر دیکھا۔

امر کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ مالا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اور امر کے پاؤں پر گر پڑی ۔۔۔ دور اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نے دونوں کو چونکا دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا پڑے۔

"ایک نئی منزل ہمارا انتظار کر رہی ہے مالا۔" اور امر مالا کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے روشنی کی طرف چل پڑا

●●

فرشتے کی محبت

اماوس کی کالی رات۔ سڑک پر چلنے والوں کا تانتا ختم ہو چکا تھا۔
کسی وقت پاؤں کی چاپ سنائی دیتی۔ لیکن جلد ہی خاموشی کے عالم
میں کھو جاتی۔

اشوک چارپائی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔
وہ خود ہی بڑبڑایا۔ دُنیا کہتی ہے۔ جوانی اور نیند کی گہری دوستی ہے لیکن
وہ بھی آج روٹھ گئی۔ اشوک پلنگ سے اٹھا۔ کمبل کو جسم کے گرد لپیٹا۔
اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر برآمدہ میں آگیا۔ وہاں سے بھی اس کا دل اُکتا
گیا۔ وہ کھلی ہوا میں قدم بھرنے لگا۔ خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔
جوانی نے انگڑائی لی۔ آنکھوں میں نیند کی جگہ مستی چھا گئی۔ اُس کا چہرہ کھل اٹھا۔
چاروں طرف نظر دوڑائی، خاموشی دیکھ کر دل اُداس ہو گیا۔ آنکھوں سے

قطرے گر گر گالوں پر لڑھک گئے ۔ گزرا زمانہ یاد آگیا ۔ کبھی گھر میں ہما ہمی رہا کرتی تھی ۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک جمگھٹا لگا رہتا تھا ۔ باتوں ہی باتوں میں وقت گزر جاتا تھا ۔ بعض اوقات ماں کہا کرتی تھی ۔ اب تو ہونے دیجئے ۔ لیکن یہ کھیل ان کے جوان ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ۔ ایک سال کے عرصہ میں ہی پورے خاندان کا صفایا ہو گیا ۔ موت یکے بعد دیگرے چُن چُن کر اپنے ساتھ لے گئی ۔ صرف اشوک کو چھوڑ گئی ۔ لمبی چوڑی دنیا میں آہیں بھرنے کے لئے رونے چلانے کے لئے ۔

اشوک کا باپ کوئی امیر آدمی نہ تھا ۔ معمولی کاروبار تھا اس کا وہ بھی اُس کی موت کے بعد ٹھپ ہو گیا ۔ اشوک کے لئے صرف سرمایہ غم تھا جس کو وہ سینے سے لگائے دن کاٹ رہا تھا ۔

اشوک آسمان کے تارے گننے لگا اُس نے دیکھا ایک ستارہ ٹوٹا ۔ اور زمین کی طرف بھاگنے لگا ۔ اشوک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا ۔ چند منٹوں میں لاکھوں کروڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے ستارہ زمین کے قریب آگیا ۔ اشوک کی آنکھیں چندھیا گئیں روشنی غائب ہو گئی ۔ اندھیرا چھا گیا ۔ اشوک خیالات کا تانا بانا بُننے لگا ۔

راکٹ کئی گھنٹوں میں چاند تک پہنچتا ہے ۔ لیکن ستارہ سیکنڈوں میں ۔ آسمانی دُنیا میں سائنس نے کتنی ترقی کی ہوئی ہے یہ ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے ۔

چلنے کی آواز نے اشوک کو چونکا دیا ۔ سامنے سے ایک خوش پوش نوجوان کو

اپنی طرف آتے دیکھ کر اشوک کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نوجوان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اشوک کے ہاتھ خود بخود اُٹھ گئے۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں" اشوک نے کہا۔

"میں تو آپ کو صدیوں سے جانتا ہوں اشوک۔ کئی بار ملے۔ کئی بار جدا ہوئے۔ آج پھر تمہاری یاد مجھے کھینچ لائی۔ میں تمہارا دکھ درد نہ دیکھ سکا۔ چلا آیا درد بٹانے" اجنبی نے جواب دیا۔

اجنبی نے اشوک کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کمرہ میں آ گئے۔ بجلی کی روشنی میں اشوک نے اجنبی کو سر سے پاؤں تک کئی بار دیکھا۔ دماغ پر زور ڈالا۔ یادداشت کو کریدا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ اجنبی اب بھی اشوک کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"میں نے تمہیں ایک بار کہہ دیا ہے اشوک۔ میں کوئی غیر نہیں ہوں۔ تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا سونا پن دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔ آ گیا۔ میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا تمہیں۔"

"نہیں تو۔ لیکن سوچتا ہوں۔ میری بد قسمتی کا سایہ کہیں آپ پر نہ پڑ جائے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو اشوک۔"

دن گزرنے لگے۔ اشوک کی محبت مدن سے دن بدن جوان ہونے لگی۔ اشوک نے باپ کا کھویا ہوا بیوپار پھر سنبھال لیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر کے بیوپاریوں کی آنکھوں کا تارا بننے لگا۔ مدن کی زیر نگرانی اس نے بیوپار کی بنیاد دیانت داری پر کھڑی کی جو جلد ہی خوبصورت عمارت کی شکل بن

دکھائی دینے لگی۔ اشوک کے باپ کا نام تو کوئی نہ جانتا تھا۔ لیکن اشوک اور مدن کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اشوک نے مدن کے بارے میں کئی بار سوچا۔ لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"آپ نے میری قسمت بدل دی، مجھے نئی زندگی دے دی۔ لیکن آج تک یہ نہیں بتایا کہ آپ ۔"

مدن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کے پاس رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے، دیکھا ہے۔ رنج ہوا، درد ہوا۔ اور غم بھی سوچتا ہوں، دنیا میں دولت کو کیوں اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اس کا زہر اس قدر کیوں ہے۔ عزت و آبرو کو داؤ پر لگا کر انسان دولت اکٹھی کرتا ہے۔ اور ایک دن یہاں ہی چھوڑ جاتا ہے۔" مدن نے ایک سرد آہ بھری "مجھے دکھائی دیتا ہے اشوک اب دنیا تباہی و بربادی کی منزل کے قریب آگئی ہے۔"

اشوک نے کہا۔

"پیسہ کے بغیر انسان کی زندگی ہی کیا ہے۔ چند دن پہلے میں کیا تھا۔ لوگ مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اب آپ کی بدولت ....."

"میری نہیں دیانت داری کی بدولت۔ اشوک مانتا ہوں کہ انسان کی زندگی میں دولت کا کس قدر دخل ہے۔ لیکن نہ دولت ہی کیا جو انسانی خون سے رنگی ہوئی ہو۔ جس میں ہزاروں انسانوں کی چیخ و پکار رہے۔ جس نے نفرت کا کفن اوڑھ رکھا ہو۔ دھوکا فریب مکاری سے اکٹھی کی گئی دولت کا سایہ انسان کے

چلن پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا اشوک۔"

" انسان کے سب عیب دولت کے سائے میں چھپ جاتے ہیں مدن یہ دنیا ہے۔ یہاں انسان رہتے ہیں دیوتا نہیں۔"

مدن مسکرایا۔ " یہی تو بات ہے اشوک جس کی وجہ سے ہم دنیا والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔"

" میں تمہاری بات نہیں سمجھا مدن۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

" کچھ بھی نہیں۔ معلوم نہیں کیا خیال آگیا اور کیا کہہ گیا۔"

" چھوڑیے ان باتوں کو۔ ہم جس سمندر میں رہتے ہیں۔ وہاں کی مچھلیوں کے ساتھ ہی رہنے میں مزہ ہے۔ مدن ہاں میں بھول ہی گیا۔ لالہ کیدار ناتھ جی آئے تھے۔ تمہارے رشتہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

" میرے رشتہ کے بارے میں۔"

" تمہیں وہ زنجیروں میں باندھنا چاہتے ہیں۔ اپنی اکلوتی لڑکی رادھا کی زلفوں میں تمہیں جکڑنا چاہتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے قید ہونے کا۔"

" میں تو تمہاری شادی کی سوچ رہا ہوں اشوک۔ تمہاری شادی ہو جائے میرا کام ختم ہو جائے۔ رادھا کو تو تم نے دیکھا ہوگا۔"

" ہاں دیکھا ہوا ہے۔ کالج میں میرے ساتھ تھی۔ خوبصورت ہے اور سادگی و شرافت کی تصویر ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اشوک خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت جھانکنے لگی۔ رادھا کی موہنی محبت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ مدن

نے اشوک کی حالت دیکھی۔ وہ مسکرایا۔ صرف اتنا کہا۔ "محبت بھی کبھی چھپائے چھپ سکتی ہے۔"

کدارناتھ کی ملاقات مدن سے ہوئی اُس وقت اشوک دوکان پر موجود نہ تھا۔ کدارناتھ نے ناطے کا ذکر چھیڑا تو مدن نے پوچھا۔

"آپ کا اشوک کے متعلق کیا وچار ہے۔ والد صاحب۔"

"اشوک اور تمہارے بیچ کوئی فرق نہیں دیکھتا مدن۔ میں اپنی رادھا تم دونوں میں سے کسی ایک کو دینا چاہتا ہوں۔ لیکن تم بڑے ہو۔ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے چھوٹے کی شادی نہیں ہوا کرتی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ شادی زندگی کا سودا ہوتا ہے رائے صاحب۔"

لالہ کدارناتھ چلا گیا۔ اور جب اشوک دکان پر آیا۔ اُس کے چہرے پر اداسی کی لکیریں تھیں۔ مدن نے اُس کی حالت دیکھی اور مسکرانے لگا۔

"لالہ کدارناتھ جی آئے تھے اشوک۔"

"ہو گئی بات۔"

"ہاں وہ تو جلد سے جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہاں بھی کیا دیر ہے۔ بھابی آئے گی۔ ہوٹل کا کھانا چھوٹ جائیگا۔ گھر میں چہل پہل رہے گی۔"

"میری بھی یہی خواہش ہے اشوک۔"

دن گزرنے لگے۔ اشوک نے موہن کو رادھا سے ایک دو بار باتیں کرتے دیکھا۔

رائے صاحب گدارناتھ کے ہاں جاتے بھی دیکھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ کام کاج سے دل اچاٹ ہو گیا۔ دوکان سے غیر حاضر رہنے لگا۔ رات کو دیر سے گھر لوٹنے لگا۔ اب وہ مدن سے بھی خوش ہو کر بات نہ کرتا تھا۔ مدن کے اصرار کرنے پر ایک دن اشوک نے دبی زبان میں کہہ دیا۔ کہ اب وہ یہاں کی زندگی سے اکتا گیا ہے کہیں دُور چلا جائے گا۔ جہاں اس شہر کی ہوا بھی نہ پہنچ سکے۔"

شگن کا دن آ گیا —— مدن نے قیمتی سوٹ زیب تن کیا۔ یہ وہی پوشاک تھی جو وہ پہلے دن پہنے ہوئے اشوک کے پاس آیا تھا۔ اشوک نے نہ تو شیو بنائی۔ نہ ہی کپڑے بدلے مدن نے کئی بار کہا۔ "خوشی کا دن ہے۔ کپڑے بدل ڈالو۔ لوگ کیا سمجھینگے۔ اشوک کو اس ناطے میں اعتراض ہے۔ اس لئے دیوانوں کی صورت بنا رکھی ہے۔"

پھر بھی اشوک پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے جھنجھلا کر کہا۔

"جس کا گھر لُٹ رہا ہو۔ مدن وہ ......" اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مدن کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے اشوک۔ کہ میں تمہاری دیوانگی سے اپنا ارادہ بدل لوں گا تو یہ ناممکن ہے۔ مجھے تمہاری حرکت پسند نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں رادھا ..." رادھا کا لفظ سنتے ہی اشوک وہاں سے اٹھ گیا۔ کمرہ سے باہر جانے لگا، تو مدن نے اس کو بانہہ سے پکڑ لیا۔ اور کہا۔

"میں چاہتا تھا اشوک۔ چند دن اور تمہارے پاس رہوں۔ لیکن آخر تم انسان ہو۔ فرشتے نہیں۔ زمین کے رہنے والے ہو۔ آسمان کے نہیں۔

دُنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے۔ ایک عورت کی محبت میں اپنے دوست کو ٹھکرا دیا ہے تم نے۔ یہی مجھے اُمید تھی۔"

اشوک پھر بھی خاموش رہا۔ مدن نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اشوک! سگائی تمہاری ہو رہی ہے میری نہیں۔ میں تو آج کے دن کا انتظار کر رہا تھا منگنی ہونے سے پہلے ہی میں چلا جاؤں گا۔ اب تو ہنسو اشوک۔"

اشوک نے نظریں اٹھائیں۔ جو غم کے بوجھ سے بھاری، سوئی ہوئی تھیں۔ مدن نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"تمہیں غالباً معلوم نہیں۔ میں اس دُنیا کا رہنے والا انسان نہیں ہوں۔ جو دوسرے کی محبت پر ڈاکہ ڈالوں۔ دُوسروں کی دولت کو لوٹنے کی کوشش کروں۔ دھوکا فریب مکاری سے اپنا اُلّو سیدھا کروں۔ میں تمہارا دوست ہوں..........

دوست! میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔ عورت کا پریم کیا چیز ہے سُنو۔ صدیاں گزریں، دونوں اکٹھے ہوئے تھے، دوست بنے تھے۔ میں نے ایک ہی جنم میں اپنا جنم شدھار لیا لیکن تم نے بار بار دُکھوں بھری دُنیا میں جنم لیا۔ اور نہ معلوم۔ کتنی بار اور جنم لیتے رہو گے۔ تمہارا دُکھ درد نہ دیکھ سکا تھا۔ چلا آیا۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اپنی دُنیا میں چلا جاؤں گا۔ رادھا تمہاری ہے۔

اِس جنم کی نہیں۔ پہلے بھی کسی جنم میں تم دونوں اکٹھے رہ چکے ہو.........

.........میں تم سے دُور بہت دُور، بہت دُور جا رہا ہوں۔ جب کبھی میری یاد آئے۔ رات کو آسمان پر مجھے دیکھ لینا۔ میں تمہیں مسکراتا ہوا نظر آؤں گا۔"

اشوک لپکا کہ مدن کو سینے سے لگالے۔ لیکن مدن غائب تھا۔ ایک دُھندلی سی روشنی آسمان کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ اور اشوک ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھے جارہا تھا

ایک خواب ایک تعبیر

چوکیدار نے گھڑیال کے پاٹ سینے پر ایک ایک کر کے بارہ ضربیں لگائیں - وہ کافی دیر تک لرزتا رہا۔ ڈر کے مارے کبھی آگے آتا۔ کبھی پیچھے جاتا۔ لیکن جلدی ہی وہ پھر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔
رام سرن نہ معلوم کیوں گھڑیال کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ دیکھتا ہی رہا اور دو موتی اُس کے رُخساروں سے لڑھکتے ہوئے فرش پر آگرے۔

وہ بڑبڑایا۔

میں بھی کئی سالوں سے چوٹیں کھا رہا ہوں۔ ایک کے بعد دوسری۔ بچپن میں ماں کی جُدائی - پھر باپ کی مفارقت۔ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے چار لڑکے مجھے روتا چلاتا چھوڑ گئے۔ اور پھر آخری بچے کو

جنم دے کر رفیقۂ حیات بھی الوداع کہہ گئی۔ بچے کو گود میں لئے پھرتا رہا۔ اپنے حلق کا نوالہ اُسے دیتا رہا۔ ایک ہی امید پر۔ بڑا ہوگا، تعلیم حاصل کرے گا۔ بڑا آدمی بنے گا۔ میں یہ تمام چوٹیں بھول جاؤں گا۔

.... لیکن میں اب بھی گھڑیال پر ضربیں لگا رہا ہوں۔ چوکیداری ہی کرتا ہوں۔ حالانکہ ہونہار فرزند ....

اور رام سرن پر بے ہوشی طاری ہو گئی، وہ چارپائی پر گر گیا۔ گزرے دنوں کے تصور میں کھو گیا۔........

"منوہر۔ اب تم نے بی۔اے پاس کر لیا۔ پچھلی جاتی والوں کے لئے ملازمت کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ تم جلد نوکر ہو جاؤ گے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بہت جلد۔ ابھی ابھی چھٹی ملی ہے۔ کل کے لئے بڑے دفتر میں بلایا ہے۔ آپ کی آشیرباد چاہیئے پتاجی۔"

"تم کل ضرور نوکر ہو جاؤ گے۔ میرے لال۔ میرا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔ پھر مجھے کوئی چوکیدار نہیں کہے گا۔"

"میں کبھی آپ کو نوکری نہیں کرنے دوں گا پتاجی۔ آپ نے جو تکلیف اُٹھائی ہے۔ وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ دن اور رات نوکری کرکے کالج کا خرچہ دیا ہے۔"

"وہ تو میرا فرض تھا میرے بچے۔ تم ہی اب میری زندگی کی

لائق ہو۔ مجھے یہی امید تھی۔ تم سے آج میں بہت خوش ہوں۔
میرے لال۔ میں سارے غم بھول گیا ہوں۔

اور منوہر ملازم ہو گیا۔ اُس کو پانچ سو روپے کی ملازمت
مل گئی۔ جب رام سرن نے یہ خبر سُنی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔
چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ بار بار اُس نے منوہر کا سر چوما۔ اُسی
وقت اس نے روپے کے لڈو منگوا کر محلے میں بانٹے۔
لوگوں سے مبارک باد لی۔ ہر آدمی رام سرن کی قسمت کو سراہ
رہا تھا۔

دن گزرنے لگے۔ منوہر ہر ماہ تنخواہ لا کر رام سرن کی ہتھیلی
پر رکھتا۔ اور جب ضرورت پڑتی اس سے مانگ کر لے۔ لیکن
یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

ابھی منوہر کو دفتر میں آئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ مس
رمیا تبدیل ہو کر اس کے دفتر میں آ گئی۔

اٹھارہ سال کی نوجوان دوشیزہ موجودہ زمانے کے فیشن
کی دلدادہ جس کی تنخواہ غالباً اُس کے فیشن پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔
اُس کی کرسی منوہر کے سامنے ہی تھی۔ دو چار دن آنکھوں
نے ضبط سے کام لیا۔ اس کے بعد اشاروں سے باتیں ہونے
لگیں۔ منوہر کے دل میں ہلچل ہونے لگی۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ
ڈھونڈ کر مس رمیا سے بات کرتا۔ یہ باتیں بڑھتے بڑھتے

محبت کی صورت اختیار کر گئیں ایک دن مس رمبا نے منوہر سے کہا۔

"منوہر۔ میں آج آتی دفعہ دو ٹکٹ سنیما کے لیے آئی ہوں۔ چلو گے میرے ساتھ۔"

منوہر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ انوائٹ کریں اور میں نہ چلوں۔ ضرور چلوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"یہیں سے اکٹھے کیوں نہ چلیں۔"

"ابھی وہ وقت نہیں آیا، مسٹر منوہر۔"

اور منوہر خاموش ہو گیا۔

اس شام منوہر بہت خوش تھا۔ اس نے جلدی جلدی ٹیبل سے فائلیں اٹھا کر الماری میں پھینک دیں، اور ساڑھے چار بجے ہی چلنے کی تیاری میں لگ گیا۔ رمبا نے منوہر کو اس حالت میں دیکھا تو مسکرادی۔ زیرِ لب اس نے کہا۔

"ابتلائے عشق ہے۔"

منوہر نے سُنا۔ نظریں جھکا لیں اور فائل کو سامنے رکھ کر وقت گزارنے لگا۔

سینما کا شو ختم ہوا۔ منوہر خوش تھا۔ رمبا بھی خوش تھی۔

دراصل منوہر رمبا کو دل سے چاہنے لگا تھا۔ وہ اس کے خواب دیکھتا۔ خیالات کی دُنیا سجاتا۔ کئی کئی پروگرام بناتا اور جب دوسرے دن رمبا کے سامنے آتا تو سب کچھ بھول جاتا۔

منوہر اب وہ منوہر نہ تھا۔ اس میں تبدیلی آگئی۔ وہ بھی فیشن ایبل بننے لگا۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ اس نے کئی ایک سُوٹ سلوائے۔ ہر سُوٹ کے ساتھ الگ الگ ٹائی خرید لی۔ بُوٹ۔ سفید۔ بردن۔ سیاہ اور لائٹ بردن۔ ہر روز سُوٹ تبدیل کرنے کی اس نے عادت ڈال لی۔

ایک دن رام سرن نے کہا۔

"بیٹا! اس قدر اگر خرچ کرتے رہو گے تو تمہاری شادی کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

"آپ میری شادی کی فکر نہ کیجئے پتا جی۔! زمانہ بدل گیا ہے۔ اب والدین کو اولاد کی شادی کی چنتا نہیں کرنی چاہیئے۔ باقی رہا سوال خرچہ کا وہ وقت پر سب ہو جائے گا۔ مجھے دفتر میں اپنی پوزیشن بھی تو رکھنی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔"

دن گذر رہے تھے۔ رمبا اور منوہر کی محبت کا چرچا ہر ایک کی زبان پر تھا۔ رمبا پہلے ہی بدنام تھی۔ کچھ عرصہ پہلے کندن کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھا۔ کندن کا گھر برباد ہو جاتا۔

لیکن اُس کے ایک قریبی رشتہ دار بابو دیاغ رائے جو دفتر میں سپرٹنڈنٹ تھے انھوں نے ربا کو تبدیل کرا دیا۔

ربا کو کندن کے بدلے منوہر مل گیا۔ اس سے بھی خوبصورت نوجوان اور کنوارہ ۔ ربا منوہر کو پا کر اپنے آپ کو بھول گئی۔

دسمبر کی ۲۶ تاریخ تھی۔

منوہر نے ربا کے لئے تحفہ خریدا۔ ربا کا جنم دن تھا اور منوہر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ منوہر نکلس لے کر آیا۔

ربا نے اپنے والدین سے اُس کا تعارف کرایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔

باتوں باتوں میں جب منوہر سے اُس کے والدین کے متعلق دریافت کیا گیا تو منوہر نے بتایا۔

بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کوئی بہن نہیں۔ کوئی بھائی نہیں۔ دُور کے رشتہ میں ایک چاچا ہے، جس کے ہاں رہتا ہوں۔

ربا کے والدین نے مزید کچھ دریافت نہ کیا۔

بر سرِ روزگار۔ اور پھر اکیلی جان۔ کوئی ذمہ داری نہیں۔ ایسا لڑکا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب منوہر جانے لگا تو ربا کے باپ نے کہا۔

"چند ایک ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اگر فرصت ملے تو کل آجائیے۔"

"ضرور حاضر ہوں گا - پتاجی -"

پتاجی کا لفظ سُنکر رمبا کے باپ کی آنکھیں چمک اٹھیں -

دوسرے دن جب منوہر دفتر آیا تو اس نے رمبا کو عجب حال میں پایا - بہت خوش تھی وہ - اس نے منوہر سے پوچھا -

"ٹی پارٹی کب ہوگی -"

"کس بات کی -"

"وہ بھی میں ہی بتاؤں -"

"تو اور کون بتائے گا -"

"وہ تو شام کو پتاجی بتائیں گے -"

"آخر بات کیا ہے - رمباجی -"

"پتاجی ہم دونوں کو زنجیروں میں جکڑ رہے ہیں -"

"اچھا یہ بات ہے - قید بھی مجھے کیا جا رہا ہے اور مٹھائی بھی مجھ سے ہی مانگی جا رہی ہے -"

"تو اور کس سے مانگوں - پتاجی سے -"

دونوں ہنسنے لگے -

"اچھا، شام کو گے لارڈ چلیں گے -"

"لیکن پتاجی تو آپ کا انتظار کریں گے - آج شام کو -"

ہاں! میں بھول ہی گیا تھا - تیج کے بعد چھٹی کر لیتے ہیں - اب ڈر کس کا -

شام کو منوہر رمبا کے ساتھ گھر آیا۔ چند ایک مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ رمبا کے پتا نے اُن سے اشاروں میں کچھ باتیں کیں۔ انہوں نے سر ہلا کر رضا مندی ظاہر کی۔

رمبا کے باپ نے پانچ صد روپے کے نوٹ نکال کر منوہر کے ہاتھ میں دیئے۔ اور کہا۔

"بیٹا منوہر! میں اپنی رمبا کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہوں۔ میرے گھر کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ میں نے اپنی جائید اد رمبا کے نام کر دی ہے۔ تم اب اس کے مالک ہو گے۔ ہاں اب تمہیں یہاں ہی رہنا ہو گا۔"

منوہر کچھ نہ کہہ سکا۔ اور سر جھکا لیا۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں منوہر۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے پتا جی۔"

اور منوہر گھر آ گیا۔ اُس نے رام سرن سے اس کا ذکر تک نہ کیا۔

جب دوسرے دن دفتر جانے لگا تو کہا۔

"میرے خیال میں آپ کہیں نوکری کی تلاش کر لیں۔ تو اچھا ہی ہو گا۔"

"کیوں؟ تمہاری تنخواہ تو اب چھ سو روپے ہو گئی ہے۔ ہم دونوں کے لئے بہت ہے۔"

"ہے تو بہت لیکن پھر بھی کوئی کام دھندہ کرتے رہو گے تو اچھا

ہی ہو گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا! سارا دن بیٹھے بیٹھے نہیں گزرتا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ چھوٹی موٹی کوئی دکان بنا لوں گا۔ اور کچھ نہ کچھ کما لیا کرونگا۔ عزت بھی ہو گی۔ لیکن کئی مہینوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں کل جاؤں گا۔ پرانے مالک کے پاس۔ ممکن ہے وہ کوئی جگہ دے دیں۔"

"ضرور جانا، وہ آپ کو ضرور نوکر رکھ لیں گے۔"

"ہاں رکھ لیں گے۔ تم اب دفتر جاؤ۔ دیر ہو جائے گی نہیں۔"

اور منوہر چلا گیا۔

رام سرن سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک لڑکا ہے اچھی تنخواہ پاتا ہے۔ باپ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن اس میں اس کا قصور نہیں۔ وہ لڑکا ہے، باپ نہیں۔

رام سرن اسی دن ورکشاپ میں آگیا۔ مالک ہرنامداس نے دیکھا۔ دور ہی سے آواز دی۔

"رام سرن! آج تم یہاں ......"

"ہاں مالک۔ پھر نوکر ہونے آیا ہوں۔"

"لیکن اب تو تمہارا لڑکا اچھی تنخواہ پاتا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں پاتا ہے۔ اچھی تنخواہ۔ مجھے بھی تو کام کرنا ہے۔ مالک۔"

"اچھا تو آج ہی کام پر آ جاؤ - تمہارے لئے ہر وقت جگہ خالی ہے۔
—— رام سرن - آ"

اور رام سرن ملازم ہو گیا - وہی چوکیدار گھڑیال بجانے والا - ورکشاپ کی گھڑیال بجانے والا - ورکشاپ کی حفاظت کرنے والا۔

اس کے بعد اس نے کئی دن تک منوہر کی صورت نہ دیکھی - ایک دن مالک نے رام سرن کو ہوٹل میں کھانا لانے کے لئے بھیجا -

منوہر اور رمبا - دولہا دولہن کے لباس میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے -

رام سرن نے منوہر کو دیکھا - خوشی سے اس کے قدم ناچ اٹھے خیال آیا، پاس جا کر جی بھر کر دیکھے ۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو - لیکن پاس دلہن کو دیکھ کر جانا مناسب نہ سمجھا - وہیں کھڑا ہو گیا - اور انتظار کرنے لگا۔

منوہر اور رمبا ہاتھوں میں ہاتھ لئے اور مسکراتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلے -

رام سرن نے منوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"منوہر! تم"

"کون ہو - ہٹو پیچھے - سوٹ کا ستیاناس کر دیا - مانگنے والے ہوٹل میں بھی دم نہیں لینے دیتے"

"منوہر، میں مانگنے والا نہیں رام سرن ہوں"

"کون، پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں کسی رام سرن کو نہیں جانتا۔ ہٹو راستہ سے۔ اندھے کہیں کے۔ دیکھتے نہیں۔ ہوٹل ہے"

رام سرن نے پھر منوہر کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن منوہر نے رام سرن کے طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھا کہ گیٹ کیپر نے سنبھال لیا۔

رام سرن کا دل رو اٹھا۔ اُسے لختِ جگر سے قطعی یہ اُمید نہ تھی جو حسین خواب وہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ حقیقت سے کوسوں دُور تھے۔ اُس نے آہ بھری۔ آنسو پونچھے۔ اور مالک کا کھانا لے کر ورکشاپ کی طرف چل دیا۔

تب ہی گھڑی نے دو بجائے۔ رام سرن جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اُٹھا۔ اور گھڑیال پر دو ضربیں لگا دیں۔

●●

نیلو

وہ نومبر کی ایک برفانی رات تھی اور مجھے کشمیر آئے ابھی تین دن ہی ہوئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں آسمان سے باتیں کرتی چٹان پر کھڑا کاٹیج کسی قوی ہیکل دیو یا بھوت کی طرح ہر آنے جانے والے کو ڈرا رہا تھا۔ کمرے میں لٹکتے ہوئے دو دستی لیمپ ایسے دکھائی دیتے، جیسے بھوت کی آنکھیں سلگتے انگارے کی طرح دہک رہی ہوں۔ میں اُس بھوت کے آغوش میں بیٹھا۔ کاغذات پر جھکا کام میں مصروف تھا۔ پاس پڑی سلگتی انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی اور اُس پر اُبلتی چائے کی آواز برابر میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی بند تھے۔ اتنے بڑے کمرے میں میں اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا کبھی کبھی سرد ہوا کا جھونکا کھڑکی یا دروازے کی جھریوں سے اندر داخل ہو کر

بدن کو سن کر دیا - سردی کا زور بڑھنے لگا - میں نے کمبل کو اچھی طرح اپنے ارد گرد لپیٹا اور چائے کو پیالے میں ڈال کر چسکیاں لینے لگا - گرم گرم چائے لے اندر جاتے ہی بدن میں ایک نئی جان ڈال دی مگر باہر سے آتی شائیں شائیں کی آواز - دروازوں اور کھڑکیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ باہر طوفان اور برف باری جوبن پر ہے اس شدت کی سردی میں مجھے اکیلا پن بری طرح محسوس ہونے لگا - میری نظریں غیر ارادی طور پر کمرے میں دوڑنے لگیں - ایک کونے میں پڑی میز اور اس پر ایک پرانی وضع کا کشمیری طرز کا پھولدان - جس میں خوشنما پھول - بالکل تر و تازہ اور شگفتہ تھے - جیسے کسی نے ابھی رکھے ہوں - نظریں ان پر جم گئیں - اور میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ پھول کہاں سے آئے - کون لایا ہے ان کو - کس کو میری خوشنودی کا احساس ہے - طرح طرح کے خیالات آئے - لیکن میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا - میں کتنی دیر چھت کی طرف انہی خیالات میں کھویا ہوا دیکھتا رہا -

شاعر کی بھی کیا زندگی ہے! کبھی یہاں کبھی وہاں - کبھی ریگستانوں میں اور کبھی برفانی پہاڑوں میں -

خیالات دوڑ لگا رہے تھے - اور میں سوچ رہا تھا -

میں کیوں اس طرح بھٹک رہا ہوں، کیوں ایک لمحہ کے لئے بھی چین نصیب نہیں ہوتا - وہ کون سی چیز ہے جو مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتی ہے -

میں لکھتا ہوں۔ کس کے لئے لکھتا ہوں۔ اور کیوں لکھتا ہوں۔ کون میرے دل میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔ میں آج تک کیوں سمجھ نہیں پایا۔ صرف یہی سمجھ سکا ہوں کہ میرے کانوں میں کسی کی سریلی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ میں گنگنانے لگتا ہوں۔ دل کی تاریں خود بخود راگ الاپنے لگتی ہیں۔ اور قلم لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اتنا سوز۔ اتنا درد۔ کون ہے وہ۔ جو میرے ایک ایک شعر میں بھر دیتا ہے۔

ٹن ٹن ٹن۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک بارہ بجے تھے ــــ نیند کا غلبہ۔ میں بکھرے کاغذوں کو اکٹھا کرنے لگا ــــ جسم کانپنے لگا۔ بدن ساکت ہو گیا اور آنکھیں دہشت سے بے حرکت ہو گئیں، یہ کس کی آواز اتنے رات گئے کون ہے۔

میں گھبرا کر کرسی سے اُٹھا۔ کھڑکی کے پاس آیا چٹکنی کھولی۔ ہوا کے ایک ہی جھونکے نے دروازے کے پٹ کھول دیئے۔ لیمپ اور زور سے ہلنے لگے۔ اُن کی روشنی دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے سینے پر دوڑنے لگی۔ میں نے جہاں تک نظر پہنچی دیکھا۔ مگر بے سود۔ سُننے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

کیا میرے کانوں نے دھوکا کھایا ہے۔ یا ایک وہم۔

سرد ہوا خون کو منجمد کر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کرنے کی غرض سے ہاتھ بڑھائے۔ مگر وہ بھی رک گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پہاڑوں

کے دامن سے آرہی پراسرار سُریلی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کتنی سُریلی تھی وہ دل ناچنے لگا۔ مستی میں جھومنے لگا۔ لیکن روح کانپ اٹھی۔ ان پہاڑوں میں کوئی آواز نہ تھی صرف جنگل ہی جنگل۔ یا اونچے برفانی تودے۔

آدھی رات کو کون گا رہا ہے۔

مجھے اپنے پاس کون بلا رہا ہے۔

آواز جانی پہچانی ہے

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آواز میرے قریب تر ہوتی جا رہی ہے میں بخوبی سُن رہا تھا اور سمجھ میں بھی آرہا تھا۔ سوز بھری آواز میں گا نے گا رہا تھا۔

"برف گر رہی ہے۔

دنیا آرام سے سو رہی ہے۔

مگر میں جل رہی ہوں۔

میری آنکھیں تجھے دیکھنے کو بیتاب ہیں۔ میری جوانی کسی کے آغوش کے لئے ترس رہی ہے

دُور نظریں اٹھا کر دیکھو تو سہی۔ آج میں تمہارے لئے بن سنور کر آئی ہوں۔

آؤ میرے ارمانوں کو جگا دو

مجھے اپنی آغوش میں جگہ دو۔

میں تم سے جُدا نہیں رہ سکتی۔

تم سے دُور نہیں رہ سکتی۔

کب سے تڑپ رہی ہوں۔ تجھے ڈھونڈ رہی ہوں۔ بلا رہی ہوں ــ
گا گا کر تجھے نغمۂ دل سنا رہی ہوں۔
مجھے اور نہ ستاؤ۔ آؤ۔ آ بھی جاؤ۔ میرے پریتم ؟ آواز بدستور آ رہی تھی۔ میں ایک بت کی طرح کھڑا اسے سن رہا تھا۔
لیکن آہ۔ شریلی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔ غم کے طوفان نے میرے دل کو جھنجھوڑا۔
کون ہے یہ اس طوفانی۔ برفانی رات میں پہاڑوں کے دامن میں۔ تنہا گھوم رہا ہے۔ کس کو پکار رہا ہے۔ کون ہے وہ بے رحم۔ جس کو ترس نہیں آتا۔ میں۔ میں بھی تو اکثر اسی طرح کھو جاتا ہوں۔ بھول جاتا ہوں۔ دنیا کو اپنے آپ کو
میرے قدم چل پڑے۔ میری آنکھیں بیتاب ہو اٹھیں میرا دل بھاگنے لگا۔ مجھے ہوش نہ رہا۔ میں بھاگا جا رہا تھا۔ سرد ہوا طوفان اور برف مجھے کچھ بھی نہ معلوم ہو رہا تھا۔ میرے قدم خود بخود آواز کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ آواز اب بھی آ رہی تھی۔
جہاں تک نظر جاتی۔ پہاڑ ہر طرف برف کی چادر اوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ برف گر رہی تھی۔ کہیں پر کوئی اک تہہ جم کر خود بخود نیچے گر رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے۔ اور میرے پاس سے گزر گئے۔ مجھے سردی محسوس نہ ہوئی۔ مجھے خوف نہ ہوا۔ مجھے غیبی آواز کھینچے لئے جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ میں کتنی دور آ گیا ہوں۔ کہاں اور کس

سمت جارہا ہوں۔ راستہ پر چل رہا ہوں یا پتھروں سے ٹھوکر کھا رہا ہوں۔ میرے پاؤں چٹان کی مانند جم گئے۔ اور آنکھیں محوِ حیرت کسی سایے کو دیکھنے لگیں۔ آہستہ آہستہ وہ سایہ میرے نزدیک آتا گیا۔ اور بالکل قریب آگیا۔ ایک بار دل نے کہا۔ آغوش میں لے لے۔ سایہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گھنگریالے بال شانوں تک پڑے۔ سمندر سے مشابہت نیلی نیلی آنکھیں۔ ایک خاص سانچہ میں ڈھلا ہوا، چہرہ برف سے زیادہ سفید۔ دانت موتیوں کی قطار۔ میں دنگ رہ گیا۔ بنانے والے نے فرصت کے وقت بنایا تھا۔ میں ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے خود کو کالے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ گورے گورے نازک پاؤں ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے دودھ کے سفید سے بہہ رہے ہوں۔ وہ اب بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آنسوؤں کا دریا اب بھی جاری تھا۔

میری زبان سے بے اختیار نکلا: "میں آگیا ہوں نیلو"

سسکیاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئیں۔ قہقہے گونج اٹھے۔ اور کسی نے مجھے باہوں میں جکڑ لیا۔

میرے کانوں میں آواز آئی۔

"مدت سے انتظار کر رہی تھی کنول۔ میں جانتی تھی۔ تم آؤ گے۔ ضرور ایک دن آؤ گے .... اکیلا چھوڑ کر گئے تھے نا اب میں دکھ درد سب کچھ بھول گئی ہوں۔ جی بھر کر دیکھنے دو"

اس کے بعد میں کچھ نہ سُن سکا۔

دوسرے دن جب میں چارپائی پر پڑا تھا تو مالی نے جگایا۔
میرا جسم ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ بخار کی بھی حرارت ہو رہی تھی۔
اور جب مالی نے مجھے بتایا۔

"بابوجی۔ آپ رات کہاں چلے گئے تھے۔"

"معلوم نہیں مجھے۔ ہاں اتنا یاد آتا ہے کہ میں یہاں سے کہیں کیا گیا تھا۔"

"ہاں بابوجی۔ آپ کو کوئی نوجوان لڑکی ہاتھوں پر اٹھائے لا رہی تھی۔ اس نے کمرہ میں آ کر آپ کو چارپائی پر لٹایا۔ آپ کے بال سنوارتی رہی۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔ کون تھی وہ بابوجی۔"

نیلو۔ نیلو تھی۔ مالی۔ میرے خوابوں کی رانی۔ میری زندگی۔"

میں چور نہیں

رام چند جب گھر پہنچا رات کے گیارہ بجنے کو تھے۔ مِل سے وہ چھ بجے ہی فارغ ہو گیا تھا۔ پہلے وہ ایک دوست کے گھر گیا پھر دوسرے کے۔ اور پھر تیسرے کے۔ غرضیکہ اس نے پانچ گھنٹہ کا وقت ضائع کر دیا لیکن اُسے دس روپے اُدھار نہ ملے۔ اور ملتے بھی کیسے۔ مِل کا قرضہ اس کے سر پر تھا۔ ہر ماہ اس کی تنخواہ سے پچیس روپے کٹوتی ہو جاتی تھی۔ موجودہ زمانہ کساد بازاری میں بغیر گھی کے صرف تیل کا تڑکا لگا کر گزارہ کرتا تھا۔ آٹے کا بھاؤ، دالوں کا نرخ، سبزی ترکاری ہر ایک چیز مارکیٹ سے غائب تھی۔ منہ مانگے داموں ملتی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے سوکھی روٹی ملنی ضرور چاہیے۔ رام چند کا لڑکا بیمار تھا۔ جو پاس پیسہ تھا ڈاکٹر کی نذر کر چکا تھا۔ ابھی لڑکے کو آرام نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ

بچے کو صرف دودھ ہی دیا جائے یا گلوکوز۔ لیکن رام چندر یہ کہاں سے لائے؟
وہ لاچار ہو گیا تھا۔ بچے کی بیماری سے وہ پریشان تھا اس لئے وہ کئی دوستوں
کے گھر گیا تھا۔ لیکن خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ ممکن ہے کوئی دوست اس کی مدد
کر دیتا۔ وہ بھی تو رام چندر ہی کے ساتھی تھے۔ ان کے ہاں بھی اولاد تھی۔
اور پھر وہ جانتے تھے۔ کہ رام چند قرضہ لے کر چکانے کے قابل ہی نہیں ہے۔
اس لئے سب نے انکار کر دیا۔

رام چند جب لڑکھڑاتے پاؤں گھر آیا تو منسا دیوی بچے کو جھولی میں لئے
بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں دروازہ پر تھیں۔ ابھی بچے کا باپ آئے گا۔ اس
کے لئے دودھ لائے گا۔ لیکن رام چند خالی آیا۔ منسا دیوی کی آنکھوں سے
گرم گرم قطرے گر پڑے۔ رام چند نے لرزتے ہونٹوں سے کہا: "کہیں
سے ایک روپیہ بھی نہیں ملا۔"

"اب کیا ہوگا۔ میرا بچہ بغیر دودھ کے مر جائے گا۔"

"نہیں۔ میں اسے بھوکا نہیں مرنے دوں گا۔ کبھی مرنے نہیں دوں گا
بچے نے اس وقت آنکھیں کھولیں۔ اور کہنے لگا۔

"ماں۔ بھوک لگی ہے۔ کچھ دے دو۔"

"ابھی تیرا باپو دودھ لاتا ہے تو سو جا۔ بخار ہلکا ہو گیا ہے بیٹے۔ اب
تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ماں۔ کچھ کھانے کو دو۔ بھوک لگی ہے۔"

"ابھی دیتی ہوں۔ میرے بچے......"

رام چند سے دیکھا نہ گیا۔ وہ باہر بھاگ گیا۔

عالیشان دوکانوں کی قطاریں لگی تھیں۔ لاکھوں روپیہ ان پر خرچ ہوا تھا۔ ان میں وہ لوگ رہتے تھے۔ جو سونے اور چاندی سے کھیلتے تھے۔ رات کے بارہ بجنے کو تھے لیکن وہاں ناچ رنگ کی محفلیں لگی تھیں۔ شراب کے دور چل رہے تھے۔ نوٹوں کو آگ لگا کر سگریٹ سلگائے جا رہے تھے۔ اور ان کے درمیان وہ آدمی بھاگ رہا تھا جس کا بچہ بیمار تھا جو ایک پاؤ دودھ کے لئے ترس رہا تھا۔ اور باپ تھا جو مجبور تھا۔

رام چند مسکرایا —— واہ رے مالک، تیری دنیا —— دل چاہتا ہے کہ تیری دنیا کو آگ لگا دوں۔ مٹا دوں اس کا نام و نشان۔ جس میں دوسروں کے لئے درد نہیں۔ غم نہیں۔ فکر نہیں۔ چنتا نہیں۔ یہ تمہارے دولت کے ٹھیکدار، پتھر کے دل ہیں ان کے —— جس طرح ان کے محل سمنٹ سے پختہ ہیں۔ ان میں سوراخ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان کے دل ہیں۔ یہ دوسروں کی مجبوریوں سے موم نہیں ہوتے۔

وہ آگے نکل گیا۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں بتی روشن تھی۔ لیکن انسان کا نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ رام چند کے قدم وہاں ہی رک گئے۔ بچے کی آواز کانوں میں گونجنے لگی —— "بھوک لگی ہے ماں۔ کچھ دے دو......!"

رامچند دروازے کی طرف بڑھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی

دکھائی نہ دیا۔ ضمیر نے آواز دی۔ چوری کرنا بڑا پاپ ہے۔ چوری کے مال سے تمہارے بچے کو زندگی نہیں مل سکتی۔ تو کیوں بُرا کام کر رہا ہے۔ بُری عادت ڈال رہا ہے۔ اگر کہیں اندر کوئی ہوا۔ اور اس نے تجھے گرفتار کرا دیا۔ تو کیا ہوگا؟ — جیل میں جانا پڑے گا۔ سزا بھگتنی پڑیگی۔ بچہ گھر پر ہی بھوکا مر جائے گا۔ ملازمت چلی جائے گی۔ تو کہیں کا نہ رہے گا۔ بیوی در بدر کی ٹھوکریں کھائے گی۔ رام چند کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ گیٹ سے سڑک پر آ گیا۔ اُس کے کانوں میں آواز آئی۔ "ماں بھوک لگی ہے...... دُودھ......"

اولاد...... اولاد...... بچہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ اور رام چند۔ تو جیل سے خوف کھا رہا ہے؟ — مکان کے اندر کوئی بھی نہیں۔ خالی مکان ہے۔ آنکھ جھپکتے ہی تیرا کام ہو جائے گا۔ نوٹوں کے بنڈل تیرے ہاتھ میں ہوں گے۔ تیرے گھر کی کنگالی دور ہو جائیگی۔ اُدھار مانگنے سے نجات مل جائے گی۔ مل کی ملازمت سے تجھے چھٹی مل جائے گی۔ چھوٹی موٹی دوکان بنا لینا — آزادی سے کام کرتا۔ خوب کمائے گا تُو۔ مزدور نہیں کہلائے گا۔ تجھے لوگ لالہ پکارا کریں گے۔ مشین چلاتا ہے۔ زندگی کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ کہیں غلطی سے ہاتھ مشین میں آ گیا، تو تمام عمر کے لئے ناکارہ ہو جائے گا۔ اپاہج ہو جائے گا — دیکھتا کیا ہے...... لگا چھلانگ۔ اور اُٹھا لے ایک سُوٹ کیس......

رام چند نے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔۔۔ وہ جاتے ہی دیوار کے ساتھ چمٹ گیا۔ اندر سے آواز آئی۔

" باہر کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے "

" پگلی ہمارے ہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ کس کو موت نے آواز دی ہے کہ میرے گھر قدم رکھے گا۔"

" اچھا۔ اب تم مان جاؤ۔ بہت ہو چکی۔ مجھے تمہاری یہ دولت نہیں چاہیئے۔ چوری سے اکٹھا کیا ہوا دھن نہیں چاہیئے۔ لوگوں کو بھوکا مار کر تمہیں کیا ملا۔ اب تو ہوش میں آجاؤ۔ نوجوان لڑکا چل بسا۔ لڑکی جل کر مر گئی۔ اب کیا رہ گیا ہے، اس گھر میں۔ سوائے رونے دھونے کے۔ تم دولت کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ لیکن میں روتی ہوں۔ سادہ زندگی گزارتے تھے۔ محنت مزدوری کی روٹی کھاتے تھے۔ بچے بھوکے رہتے تھے۔ لیکن یہ دکھ تو نہ ہوتا تھا۔ اب کس کام آئے گی یہ چوری سے اکٹھی کی ہوئی دولت۔"

" لیکن تم تو جانتی ہی ہو۔ میں نے لوگوں کے گھر ڈاکہ ڈالنا چھوڑ دیا ہے۔ اب چوری نہیں کرتا۔ کسی کی جیب نہیں کاٹتا۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ بیوپار کرتا ہوں۔ لڑکا مر گیا تو اس کی عمر ہی اتنی تھی۔ لڑکی جل گئی۔ تو اس میں دولت کا کیا قصور۔ وہ ....

وہ...... نہ جانے کیوں دُنیا سے تنگ آ گئی۔"

"اب کون سے دھرم پتر بن گئے ہو۔ دھندہ تو وہی ہے۔ شکل بدل گئی ہے۔ اب بھی لوگوں کے منہ کا نوالہ چھین کر من مانی قیمت پر بیچتے ہو۔ بلیک کا کام کرتے ہو۔ میں نہیں چاہتی بھوکے انسانوں کی بددعائیں لوں جس سے میرا نوجوان کیشو چلا گیا۔"

"اچھا۔ اچھا۔ آئندہ ایسا دھندہ نہیں کروں گا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

رام چند نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن دھرم چند نے دیکھ لیا۔ اُس نے پوچھا۔

"کیوں آئے تھے۔ چور کے گھر چوری کرنے۔"

"میں چور نہیں ہوں۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ دودھ کے لئے ترس رہا ہے۔ اپنی زندگی دے کر اس کی زندگی بچانا چاہتا تھا۔"

"شانتی۔ تجوری کا دروازہ کھول دو۔ اور دے دو اسے جتنا روپیہ چاہتا ہے۔"

"اس کا بچہ...... میرا بچہ...... میرا کشور......"

اور اس پتھر دل انسان دھرم چند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رام چند نے کہا: "مجھے صرف دس روپیہ چاہیے بھائی صاحب — اور کچھ نہیں — دُودھ بچے کو پلاؤں گا۔ ممکن ہے وہ بچ جائے"

اور شانتی نے نوٹوں کا بنڈل اُس کے آگے بڑھا دیا۔

لیکن رام چند نے صرف دس روپے کا نوٹ لیا۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔

شانتی نے کہا: "دُودھ گلاس میں رکھا ہے۔ یہ بھی لیجاؤ۔ تمہارا بچہ ...... میرا بچہ ...... میرا کشور"

●●

گمشدہ نیکلس

راجن نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے اخبار کی تمام سرخیاں پڑھ ڈالیں۔ اور اب لگا اشتہار پڑھنے۔ چائے میز پر پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی۔ اُس نے رامو کو آواز دی۔

"چائے تو ایک دم ٹھنڈی ہے۔ آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"میں تو گرم گرم رکھ گیا تھا بابوجی۔ آپ اخبار پڑھتے رہے ابھی اور لایا۔" یہ کہہ کر رامو چلا گیا۔

راجن نے شادی کے اشتہار دیکھے۔ جن کو پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اتوار کے دن وہ تمام اخبارات لیتا، اور شادی کے تمام اشتہارات بار بار پڑھا کرتا۔ اچانک اس کی نظر اشتہار "گم شدہ طلائی نیکلس" پر پڑی۔ "ایک نیکلس طلائی۔ شکروار شام کے چھ بجے

پنچ کوئیاں روڈ پر گرا ہوا ملا ہے۔ جس کا ہو تفصیل بتا کر
لے جا سکتا ہے ۔۔

رام ناتھ گلی نمبر ۱۴ ۲۵ قرول باغ

"واہ رے رام ناتھ ۔ چھپے رستم ۔ کل تک تو اس نے ذکر نہیں کیا۔
کہاں سے مل گیا اُسے، بے وقوف کہیں کا ۔ مالِ غنیمت ہاتھ آیا ۔ اور وہ
بھی لگا لوٹانے ۔ ابھی راستہ دکھاتا ہوں بدمشٹر کے بچے کو ۔" اور راجن
پلنگ سے کود پڑا اور کپڑے بدلنے لگا کہ رامو اتنے میں چائے
لے آیا۔

"اب رہنے دو رامو ۔ رام ناتھ کے ہاں جا رہا ہوں، وہاں
ہی پی لوں گا۔ ہاں ذرا موٹر سائیکل باہر نکال دے اور صفائی کر دے۔"
رامو چائے میز پر رکھ کر موٹر سائیکل نکالنے چلا گیا ۔ اور خود ہی
کہنے لگا ۔ کنوارے کی زندگی بھی کیا زندگی ہے ۔ منٹ میں کچھ ۔ منٹ
میں کچھ۔

اتنے میں راجن باہر آیا ۔ کِک لگائی ۔ اور لگا ہوا سے باتیں
کرنے ۔

رام ناتھ کمرے میں بیٹھا چائے نوش کر رہا تھا ۔ موٹر سائیکل
کی آواز سن کر اس نے گردن اُٹھائی ۔ راجن کو دیکھ کر اس نے نوکر کو
چائے لانے کو کہا۔

راجن نے داخل ہوتے ہی کہا ۔

"یہ کہاں کی شرافت ہے۔ آپ کو نیکلس ملا اور مجھے بتایا تک نہیں۔"

"آپ کا ہوتا تو بتاتا۔"

"یہ دھرم راج یدھشٹر کب سے بن گئے؟ تو سوچو ہے لکھا کے بلی حج کو چلی۔ جب تک ملازمت نہ تھی، ہوٹل والے کے بل سے انکار کیا کرتے تھے۔ اب مفت کا مال ہاتھ آیا۔ اور اخبار میں اشتہار دے دیا۔ لاؤ۔ کہاں ہے وہ نیکلس؟"

"نیکلس تو سینے سے لگا رکھا ہے مبادا کہیں گم نہ ہو جائے اور ندامت اٹھانی پڑے۔"

"دکھاؤ تو سہی۔ دیکھوں کتنے کا مال ہے۔" راجن نے کہا۔

رام ناتھ نے سوئٹر کے نیچے سے اُس کی جھلک دکھا دی۔

ہے تو بہت خوبصورت!" راجن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جس کا ہوگا وہ کیا کم خوبصورت ہوگی؟" رام ناتھ نے جواب دیا۔

"تو اس لئے اشتہار دیا ہے۔ معلوم ہوا۔ لڑکیوں پر چکر کاٹتے کاٹتے جی نہیں بھرا۔"

اسی وقت کسی نے گھنٹی بجائی۔

نوکر نے آکر بتایا۔

"بابو جی کوئی عورت آئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"آنے دو۔"

لمحہ بھر بعد دروپدی جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی کمرے میں
داخل ہوئی اور بیٹھتے ہی کہنے لگی۔

"میں تو دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ جسے ہیر انیکلس ملا ہوگا وہ دھرم کی مورتی
ہوگا۔ آج اشتہار دیکھا۔ دل ناچ اٹھا۔ کیا پیاری صورت ہے میرے بیٹے
کی۔ کہاں ہے ہیرا نیکلس؟۔ لاؤ۔ دروں سے پہنا نہیں۔ وہ بار بار پوچھ رہے
تھے۔"

"بیٹھیے۔ آپ ذرا تفصیل تو بتا دیجیے۔" راجن نے کہا۔

"کیا تمہیں مجھ پر شک ہے۔ بیٹا! نیکلس ہیرا ہے۔ اس کی تفصیل مجھے
معلوم ہے۔ لیکن تمہیں کیوں بتاؤں؟ میں نے سنار کے پاس بیٹھ کر خود
بنوایا تھا۔ لاؤ دے دو مجھے۔"

"معاف کرنا ماتا جی! بغیر بناوٹ اور وزن بتائے میں نہ تو نیکلس
دکھا سکتا ہوں۔ اور نہ ہی دے سکتا ہوں۔"

"کیا کہا۔ نہیں دے سکتا۔ ڈاکو کہیں کا۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ بازار میں جاتی
کا نیکلس اُتار لیا۔ اور بن گیا دھرم راج۔ نہیں دیتا جیسے تمہارے باپ کا
ہے۔ میں لے لوں گی۔ ابھی ٹیلیفون کرتی ہوں اپنے بھتیا کو۔ مجسٹریٹ ہے۔
وہ تمہارے کان پکڑ کر نکال لے گا۔"

"اچھا۔ اچھا۔ انہیں کو بھیجنا۔ وہ لے جائیں گے۔ آپ تو تشریف لے جائیے۔"
راجن نے یہ الفاظ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ کہنے لگا۔

"خواہ مخواہ مصیبت مول لے لی تم نے رام ناتھ! تم جیسا بھی شاید کوئی بیوقوف

نہ ہوگا۔ مال ملا تھا، ہضم کر جاتے۔" اور یہ کہہ کر راجن اٹھ کر جانے لگا۔

"بیٹھو۔ کوئی اور آ رہا ہوگا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے کھانا تیار ہو رہا ہے کھا لینا۔ اتوار ہے۔ یہاں ہی آج شو دیکھو۔"

"اگر تمہارے ساتھ کہیں جوتے پڑ گئے تو۔؟"

"کوئی بات نہیں آدھے آدھے بانٹ لیں گے۔" رام ناتھ نے کہا۔

"یہ بات نہیں۔ ڈرتا ہوں۔ کئی ایک چٹھیاں لکھی ہیں۔ فوٹو بھیجے ہیں۔ کئی ایک دیکھ بھی گئے ہیں۔ اگر کوئی اُن میں سے آ گیا تو میری حالت کیا ہوگی؟"

"تم اسی وقت چھپ جانا۔"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی۔

راجن نے کہا۔ "کوئی نئی مصیبت آئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ جس کی قسمت میں ہوگا وہی لے گا۔ ورنہ پڑا ہے چار پانچ دن ہم بھی پہن کر دل خوش کر لیں گے۔"

اتنے میں ایک صاحب ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے داخل ہوئے۔

"آپ ہیں مسٹر رام ناتھ؟"

"جی۔ تشریف رکھیئے۔ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟"

"وہ۔ وہ نیکلس میری والدہ کا ہے۔ کل شام پنچکوئیاں روڈ پر ہم فرنیچر خرید رہے تھے آج آپ کا اشتہار پڑھا تو خیال آیا کہ کل ہم ہی تھے پنچکوئیاں روڈ پر۔ آپ نے تکلیف کی شکریہ۔ ہاں۔ ہاں۔ وہ کتنے روپے اشتہار پر خرچ ہوئے ہیں۔ بل تو آیا ہی ہوگا۔ لے لیجئے۔"

"اور کچھ صاحب؟" راجن نے پوچھا۔

"اور ہاں۔ وہ۔ وہ یاد آیا۔ میں ریٹائرڈ سی۔ آئی۔ ڈی افسر ہوں۔ آپ کی دیانت داری سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے لئے پولیس میں کوشش کروں۔ دیانتدار افسروں کی بہت ضرورت ہے"

"معاف کرنا میں سروس میں ہوں۔ باقی رہی نیکلس کی بات۔ وہ آپ وزن تول اور بناوٹ بتا دیجئے۔ لے جائیے۔"

"بناوٹ سونے کا ہے۔ آج سے دس سال پہلے بنوایا تھا۔ نمونہ کوئی خاص تو نہیں۔ عام ہے۔ ایک جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ مرمت کروایا تھا۔ باقی رہا وزن۔ وہ تو آپ نے کروایا ہی ہوگا۔ اب کتنا ہے۔ بتائیے؟"

"آپ ہی بتائیے۔ کتنا وزنی ہے؟"

"میں نے تو چار تولے اور کچھ ماشے کا بنوایا تھا۔ اب پہننے کے بعد کچھ کم ہوگیا ہوگا۔ یا گرد وغیرہ پڑ جانے سے وزن زیادہ ہوگیا ہو۔ میں کہہ نہیں سکتا۔"

"معاف کرنا رائے صاحب! وہ نہ تو چار تولہ کا ہے اور نہ ہی دس سال کا بنا ہوا ہے۔" راجن نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر دوسرا ہوگا۔ جو ابھی دو ماہ ہوئے بنوایا ہے۔ ۳ تولے ۲ ماشے اور چار رتی کا۔ وہی ہے نا؟ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں بھول ہی گیا ہوں۔"

"اس کا وزن ۳ تولہ اور ۲ ماشہ بھی نہیں رائے صاحب! اور نہ ہی یہ نیکلس کل ملا ہے یہ شنکر دار کو ملا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ مجھے اُلّو بنانا چاہتے ہو؟ میں نے زندگی بھر لوگوں کو اُلّو بنایا۔ میرا نیکلس اور مجھ سے ہی دھوکا۔ میں نے سی آئی ڈی میں بال سفید کئے ہیں۔ بہت بے گناہوں کو جیل کی کوٹھری میں بند کرایا ہے۔ تم کیا تمہارا باپ بھی ہاتھ جوڑے تھانہ میں حاضر نہ ہوا تو میرا نام گل بہار سنگھ نہیں۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو رائے صاحب! آپ کا یہ نیکلس نہیں ہے۔ آپ پولیس میں رپورٹ لکھوا دیجئے۔"

"تھانہ تو یہاں سے بہت دور ہے ابھی دکھاتا ہوں ---- اور.... نکلواتا ہوں وہ ...... وہ نیکلس!"

گل بہار سنگھ نے چار پانچ ڈنڈے رام ناتھ پر برسا ہی دیئے۔ راجن نے گل بہار سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب بھی دیتے ہو کہ نہیں؟"

"نہیں صاحب بالکل نہیں۔ اگر اب کی بار ہاتھ اٹھایا تو آپ کی دیا سے مجھے آپ کو تھانہ میں بلوانا پڑے گا۔"

"دیکھ لوں گا۔ میرا نام بھی گل بہار سنگھ ہے۔ گل بہار سنگھ۔"

اور وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

"آیا نا لطف۔ اور اشتہار دو کہ نیکلس ملا ہے۔ لے جایئے۔ اب کسی کی نازک چپل سے مرمت ہونے کی کسر رہ گئی ہے۔"

رام ناتھ کراہ رہا تھا۔ پیٹھ پر نشان آگئے تھے۔ اور درد بھی ہو رہا تھا اس نے نوکر کو چائے لانے کے لئے کہا۔

اتنے میں پھر گھنٹی بجی۔ راجن نے رام ناتھ سے کہا۔

"مجھے تو معافی دو رام ناتھ۔ میں تو چلا۔"

"اب میں بھی چلوں گا۔ راجن! کافی سرت ہو چکی ہے۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔ یہ جو آیا ہے اس سے نپٹ لوں۔"

"تم اس سے نپٹو۔ میں صحن میں انتظار کرتا ہوں۔" اور راجن صحن میں آگیا۔

دونو جوان لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ راجن نے دل ہی دل میں کہا۔ آئی اب نازک چیل کی باری۔

رام ناتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئیے تشریف رکھیئے۔ او کنہیا چائے لانا۔"

راجن بھی کمرے میں آگیا۔

"کوئی خاص ضرورت تو نہیں" بیٹھتے ہوئے ایک نے کہا۔

"فرمائیے۔ کیسے آنا ہوا؟" رام ناتھ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نیکلس کے متعلق اشتہار پڑھا۔ سوچا۔ آپ کے درشن کر لیں۔ موجودہ زمانہ میں شاذونادر ہی کوئی ایسا انسان ہوگا۔ جو سڑک پر پڑے ہوئے مال کے لیے اپنی جیب سے خرچ کرے۔"

"معاف کرنا۔ جب گھر پر کوئی پہننے والا نہ ہو۔ تو پاس رکھنے سے کیا فائدہ؟"

"بازار میں فروخت تو ہو سکتا تھا۔"

"چند روپیوں کے لیے کون ایمان بیچے۔ ہاتھوں کی کمائی میں زندگی کا لطف

"معاف کرنا کیا یہ نیکلس آپ کا ہے؟"

رجنی نے اچٹتی نظر راجن پر ڈالی۔

"میرا تو نہیں۔ چنچل اپنا نیکلس کناٹ پیلیس میں گم کر آئی تھی۔ اس نے اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا۔ انعام بھی رکھا تھا۔ لیکن کسی نے آج تک واپس نہیں کیا۔ آپ کے اشتہار سے ہی انسانیت ٹپکتی تھی۔ چنچل نے مجھے کہا۔ چلو ان کو دیکھ لیں۔ دنیا میں کیسے کیسے انسان ہیں۔ ایک تو ہاتھ میں آئی ہوئی چیز انعام لے کر بھی واپس نہیں کرتے اور ایک وہ ہیں جو گرہ سے اشتہار دے کر مالک تک نیکلس پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو نیکلس دکھا دوں۔ ممکن ہے یہ وہی ہو جو کناٹ پیلیس میں گم ہوا تھا۔"

"لیکن وہ تو کناٹ پیلس میں کھویا ہے۔ چکوٹیاں روڈ پر نہیں۔ خیر۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو دکھا دیجئے۔"

رام ناتھ نے قمیض کا بٹن کھول کر گلے میں لٹکے ہوئے نیکلس کی ایک جھلک دکھا دی۔

"نہیں۔ یہ میرا نہیں ہے۔ وہ جڑاؤ تھا۔ اور اس کا نمونہ بھی اور تھا۔ اچھا اجازت دیجئے۔" چنچل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کے درشن ہو گئے۔ آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔"

"میرا نام چنچل ہے - پنڈارہ روڈ - کبھی تشریف لائیے - مجھے بہت خوشی ہوگی - مجھے دیانت داری سے بہت محبت ہے -"

"آپ بھی تشریف لائیے - میں بابر روڈ پر رہتی ہوں - میرا نام رجنی ہے - صبح دس بجے سے پانچ بجے تک فرینڈز ہسپتال میں مل سکتی ہوں - اچھا - اجازت" رجنی نے راجن سے کہا -

چنچل نے رام ناتھ کو اور رجنی نے راجن کو اچٹتی نظروں سے دیکھا - دعوت ملاقات دینے کے بعد وہ چلی گئیں -

راجن نے رام ناتھ کو چھیڑتے ہوئے کہا -

"مار کھانے کے بعد کچھ حاصل ہوا - اب کب چنچل سے ملنے کا ارادہ ہے ؟"

"جب تم رجنی سے ملنے جاؤ گے -"

"میں تو کل ہی ہسپتال پہنچوں گا -"

رام ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا " اب میرا تیر نشانے پر بیٹھا - ایک سال سے شادی کا اشتہار دے رہا تھا - لیکن ناکامیاب رہا - ایک ہی اشتہار نے منزل کا راستہ دکھا دیا -"

"تو کیا - یہ گم شدہ نیکلس نہیں تھا ؟ راجن نے حیرانگی سے پوچھا -

"نہیں یار - بازار سے خریدا تھا - صرف چھ روپے پچاس نئے پیسے میں اور اشتہار دیا تھا سات روپے کا -"

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

اے پیارے لوگو (تنقیدی مضامین) وارث علوی -/۲۰

اُداس شام کے آخری لمحے (افسانے) کشمیری لال ذاکر -/۱۲

اُداسی کے پانچ رُوپ (شاعری) کرشن موہن -/۲۰

انکار عبدالحق مرتبہ:- آمنہ صدیقی -/۳۵

ایک ٹانگ کی گڑیا (افسانے) کنور سین -/۲۰

اندھیرے کے قیدی (ڈرامے) کمار پاشی -/۱۰

انتظار حسین کے ۱۷ افسانے انتظار حسین -/۱۸

ارمغانِ بہار (شاعری) اے، سی، بہار -/۱۰

آنکھیں ترستیاں ہیں (یادداشتیں) پروفیسر جگن ناتھ آزاد -/۳۶

آگ (ناول) جمنا داس اختر -/۵

آواز کا جسم (شاعری) مخمور سعیدی -/۱۰

اڑان (شاعری) شباب للت -/۶

امرائی (شاعری) بدیع الزماں خاور -/۱۰

اعتراف (شاعری) عبدالرحیم نشتر ۴/۵۰

انتظار کی رات (شاعری) کمار پاشی -/۸

انسانی حقوق کیا ہیں؟ مورس کرانسٹن -/۷

احساسات (شاعری)	اوم پرکاش لاغر	۵/-
برف پر مکالمہ (افسانے)	سریندر پرکاش	۱۸/-
بسمل سعیدی ــــ شخص اور شاعر (شخصیت اور شاعری کا تجزیہ)	گوپال متل	۱۸/-
بادۂ صافی (شاعری)	صوفی بانکوٹی (مرحوم)	۱۵/-
بردہ فروش (ناول)	جمنا داس اختر	۵/-
بادل گرجیں جمنا پار (افسانے)	سدرشن شرما	۱۸/-
برگِ سبز (شاعری)	آزاد نوحی	۱۰/-
بھیگا ہوا کاغذ (شاعری)	ممتاز راشد	۱۰/-
بند کواڑ (افسانے)	نریندر لوتھر	۴/-
بیاض (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۴/-
بے وفا (ناول)	نریندر شرما	۶/-
تکون کا کرب	آزاد گلاٹی	۵/-
تیشۂ نظر (مضامین)	ابوالفیض سحر	۸/-
تیسرا سفر (شاعری)	سلیمان خمار	۱۵/-
چند ادبی شخصیتیں (خاکے)	شاہد احمد دہلوی	۳۰/-
حسابِ رنگ (شاعری)	بانی	۱۵/-
حروف (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۴/۵۰
حماقت (ناول)	ہرلدھیانوی	۶/-

حصارِ آب (شاعری) — حیات لکھنوی — ۱۰/-

خرابہ (شاعری) — من موہن تلخ — ۱۰/-

خوابِ تماشا (شاعری) — کمار پاشی — ۵/-

دائروں کا سفر (شاعری) — شباب للت — ۱۵/-

دامانِ باغباں (شاعری) — محمد عثمان عارف — ۵/-

دیپک راگ (شاعری) — مظفر حنفی — ۶/-

راجستھانی زبان وادب — ایک تعارف — ڈاکٹر فضل امام — ۱۸/-

رو بہ رو (شاعری) — کمار پاشی — ۱۰/-

روشنی پھر روشنی ہے (شاعری) — بمل کرشن اشک — ۱۵/-

راکھ (شاعری) — احتشام اختر — ۶/-

راہ گذر (شاعری) — دل ایوبی — ۴/-

زندگی اے زندگی (شاعری) — سید شکیل دسنوی — ۱۵/-

سخاروف نے کہا — آندرے۔ڈی۔سخاروف (مجلد) ۷/- (غیر مجلد) ۴/-

ساحر لدھیانوی — ایک مطالعہ — مخمور سعیدی — ۳۰/-

سوکینڈل پاور کا بلب (۲۱ افسانے) — منٹو — ۱۸/-

سلمیٰ سے دل لگا کر (اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ) نیر واسطی کے قلم سے — ۱۸/-

سبیل (شاعری) — بدیع الزماں خاور — ۱۰/-

سلکِ گہر (شاعری) — سالک عزیزی — ۴/-

سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ — مورس کرانسٹن — ۲/-

سیہ بر سفید (شاعری) مخمور سعیدی ۶/۰

شہپر (شاعری) حرمت الاکرام ۸/۰

شہرِ خوشبو (شاعری) نُور تقی نور ۵/۰

شہرِ خیال (شاعری) جلیس نجیب آبادی ۴/۵۰

شیرازہ (شاعری) مرتبین: مخمور سعیدی، پریم گوپال متّل ۱۸/۰

شیرازۂ مژگاں (شاعری) کرشن موہن ۱۰/۰

صحرا میں اذان (شاعری) گوپال متّل ۱۵/۰

صحرا کی پیاس (شاعری) شباب للت ۶/۰

صریرِ خامہ (شاعری) مظفر حنفی ۶/۰

کرماں والی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۲۰/۰

کلّیاتِ اختر شیرانی مرتّب: گوپال متّل ۱۰/۰

کلّیاتِ شاد عارفی مرتّب: مظفر حنفی ۳۰/۰

کوئے ملامت (شاعری) کرشن موہن ۱۰/۰

کینسر وارڈ (ناول) الیگزنڈر سولنسٹین ۱۸/۰

گفتنی (شاعری) مخمور سعیدی ۳/۰

گلاگ مجمع الجزائر (یادداشتیں) تین جلدوں میں الیگزنڈر سولنسٹین (مجلّد) فی جلد ۲۶/۰

(غیر مجلّد) فی جلد ۱۰/۰

گیان مارگ کی نظمیں (شاعری) کرشن موہن ۱۰/۰

گوپال متّل —— ایک مطالعہ عبدالحکیم ۱۵/۰

لاہور کا جو ذکر کیا	(یادداشتیں)	گوپال متل	۱۰/-
لال قلعہ	(ناول)	صفدر آہ	۸/-
لفظوں کا پیرہن	(شاعری)	بدیع الزماں خاور	۷/-
لبِ منصور	(شاعری)	دھرم سروپ	۹/-
قصۂ جدید و قدیم	(ایک ادبی مباحثہ)	مرتب: مخمور سعیدی	۱۲/-
میرے خیال میں	(تنقیدی مضامین)	نظیر صدیقی	زیر طبع
منٹو، شخصیت اور فن		ترتیب و انتخاب: پریم گوپال متل	۴/-
مذہب اور سائنس	(خیال افروز بحث)	مولوی عبد الحق	۱۱/-
میراجی: شخصیت اور فن		ترتیب و انتخاب، کمار پاشی	۴/۵۰
منتخب افسانے ۱۹۶۸ء		شہباز حسین، بدیع الزماں	۱۰/-
میں گواہی دیتا ہوں	(آپ بیتی)	اناتولی مارچینکو	۴/-
نام بدن اور میں	(شاعری)	بمل کرشن اشک	۱۵/-
ن۔م۔راشد۔ شخصیت اور فن		مغنی تبسم، شہریار	زیر طبع
نیا اردو افسانہ:	احتساب و انتخاب	کمار پاشی	۱۸/-
نام بہ نام	(شاعری)	رضا نقوی واہی	۶/
نئے عہد نامے کی سوغات	(افسانے)	فیاض رفعت	۱۰/-
نگاہِ شوق	(شاعری)	دھرم سروپ	۱۰/-
واپسی	(ناول)	آمنہ ابوالحسن	۱۸/-
ولاس یاترا	(طویل نظم)	کمار پاشی	۱۰/-
ہندو مسلمان	(افسانے)	ہمت رائے شرما	۲۰/-

چند معیاری قابلِ مطالعہ کتابیں
منٹو — شخصیت اور فن
ترتیب و انتخاب
پریم گوپال متل
۴۰ روپے
سو کینڈل پاور کا بلب
منٹو کے ۱۱ منتخب افسانے
ترتیب و انتخاب
پریم گوپال متل
۱۸ روپے
قصہ جدید و قدیم
ایک ادبی مباحثہ
مرتب: مخمور سعیدی
۱۸ روپے
میراجی — شخصیت اور فن
ترتیب و انتخاب
کمار پاشی
۴۰ روپے
چند ادبی شخصیتیں
شاہد احمد دہلوی کے قلم سے
دلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان میں
۳۰ روپے
نیا اردو افسانہ
احتساب و انتخاب
کمار پاشی
۱۸ روپے
انتظار حسین
کے
سترہ افسانے
۱۸ روپے
سلمیٰ سے دل لگا کر
شاعرِ رومان اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ
۱۵ روپے
افکارِ عبدالحق
مرتبہ
آمنہ صدیقی
۳۵ روپے
مذہب اور سائنس
بابائے اردو
مولوی عبدالحق کے قلم سے
۱۱ روپے
اداس شام کے آخری لمحے
(افسانے)
کشمیری لال ذاکر
۱۲ روپے
اندھیرے کے قیدی
(ڈرامے)
کمار پاشی
۱۰ روپے
پہلی کرن کا بوجھ
(شاعری)
مغنی تبسم
۱۲ روپے
صحرا میں اذان
(شاعری)
گوپال متل
۱۵ روپے
لاہور کا جو ذکر کیا
(آپ بیتی)
گوپال متل
۱۰ روپے
گوپال متل — ایک مطالعہ
محمد عبدالحکیم
۱۵ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی
مرتبہ
گوپال متل
۱۰ روپے
کینسر وارڈ
(ناول)
نوبل انعام یافتہ الیگزینڈر سولژنٹسین کے قلم سے — ۱۸ روپے
گلاگ مجمع الجزائر
(یادداشتیں تین حصوں میں)
الیگزینڈر سولژنٹسین
۴۰ روپے فی حصہ
بسمل سعیدی
شخص اور شاعر
مرتبین
گوپال متل، مخمور سعیدی، پریم گوپال متل
۱۸ روپے
شیرازہ
۲۲۹ شعرا کا انتخاب
مرتبین: مخمور سعیدی، پریم گوپال متل
۱۸ روپے
آواز کا جسم
(شاعری)
مخمور سعیدی
۱۰ روپے
رو بہ رو
(شاعری)
کمار پاشی
۱۰ روپے
حسابِ رنگ
(شاعری)
بانی
۱۵ روپے
اداسی کے پانچ روپ
(شاعری)
کرشن موہن
۲۰ روپے
لال قلعہ
(تاریخی ناول)
صفدر آہ
۸ روپے
کلیاتِ شاد عارفی
مرتبہ
ڈاکٹر مظفر حنفی
۳۰ روپے
تیشۂ نظر
(تنقیدی مضامین)
ابوالفیض سحر
۸ روپے
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس